ٹیگور کے افسانے

ٹیگور

پبلشرز
آزاد بک ڈپو لاہور

فہرس

شادی

کسی زمانے میں نامجور کے بابو مشہور زمیندار ہوا کرتے تھے۔ سالانہ خرچ اخراجات کے لئے مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ ڈھاکہ کی ململ کا کمربند یا گمنا یہ پھاڑ دیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ان کی نازک جلد کے ساتھ چھو کر چبھتا تھا۔ گڑیا کی شادی پر بھی وہ ہزاروں روپے صرف کر دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک خاص جشن کے موقعہ پر جو نہایت شان و شوکت سے منایا جا رہا تھا۔ رات کو دن میں تبدیل کرنے کے لئے انہوں نے بے شمار لمپ و فانوس جگائے۔ اور آسمان سے چاندی کی تاریں برسائیں تاکہ سورج کی کرنوں کی مانند ہوں۔

یہ حضرت نوح کے طوفان سے پہلے کی باتیں ہیں انقلاب آیا ان پرانے زمانے کے بابوؤں کی نسل جو شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے۔ دیر تک

قائم نہ رہ سکی جب یہ ایک لیمپ کا تیل جس میں بہت سی بتیاں جل رہی ہوں۔ جلد خرچ ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ٹمٹما کر بجھ جاتا ہے۔ بعینہٖ اس خاندان کی حالت ہوئی

ہمارا پڑوسی کالی بابو اس گزشتہ شان و عظمت کا آخری ٹمٹماتا چراغ ہے۔ اس کے جوان ہونے سے پیشتر ہی اس عالی شان خاندان کی شان و شوکت کا چراغ تقریباً بجھ چکا تھا۔ جب اس کا والد انتقال کر گیا تو مرگ کے اخراجات کی مشکل میں آنکھوں کو چندھیانے والی ایک زور کی چمک دے کر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور نتیجے کے طور پر دیوالہ دار ہوا۔ قرض چکانے کے لئے جائداد فروخت کرنی پڑی جو کچھ نقد روپیہ باقی بچا وہ بزرگوں کی شان و شوکت و شاہانہ اخراجات قائم رکھنے کے لئے بالکل ناکافی تھا نیچور چھوڑ کر کالی بابو کلکتہ چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا لڑکا اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور ایک لڑکی پیچھے چھوڑ گیا۔

کلکتہ میں کالی بابو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے حیرانی کی بات ہے کہ ہمارے خاندان کی کہانی ان کے خاندان کی تواریخ سے بالکل مختلف ہے۔ میرے والد نے اپنی محنت سے روپیہ کمایا۔ انہیں اس بات کا فخر تھا کہ ضرورت سے زیادہ ایک پائی بھی کبھی فضول خرچ نہیں کی ان کا لباس اور ہاتھ ایک معمولی حیثیت کے شخص کی مانند تھے۔ جو ہاتھ سے محنت کر کے روٹی کماتا ہے فضول خرچ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے انہوں نے کبھی بابو کا لقب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس کے لیئے میں ان کا اکلوتا بیٹا ان کا مشکور رہوں۔ انہوں نے مجھے نہایت اعلیٰ

تعلیم دلوائی۔ اور دنیا میں ترقی کرنے کے قابل بنایا۔ مجھے یہ ماننے میں مطلق شرم نہیں کہ دنیاوی ترقی کے لحاظ سے میں ایک خود ساختہ انسان ہوں۔ میری الماری میں پڑے ہوئے چند نوٹ مجھے زیادہ عزیز ہیں۔ بہ نسبت ایک شجرہ نسب کے جو ایک خالی خاندانی الماری میں پڑا ہوا ہو۔

میرے خیال میں یہی وجہ تھی کہ کالی بابو کا بابو خاندان کی شہرت کے وقت کے آبائی بنک میں سے جس کا اس وقت دیوالہ نکلا چاہتا تھا۔ بذریعہ چیک پبلک کریڈٹ پر روپیہ لینا مجھے نہایت ناگوار گزرتا تھا۔ میں دل میں خیال کرتا تھا کہ کالی بابو مجھے اس وجہ سے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کہ میرے والد نے اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے روپیہ کمایا تھا۔

مجھے اس بات کا خیال ہونا چاہئے تھا کہ سوائے میرے اور کوئی شخص کالی بابو سے کسی طرح کبیدہ خاطر نہیں تھا۔ دراصل اس جیسا ضعیف شخص جو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتا۔ ملنا مشکل تھا۔ شادی غمی کے موقعہ پر اس کا سلوک ہمیشہ انسانیت اور شرافت کا ہوتا تھا۔ اپنے پڑوسیوں کی تمام رسمیات اور مذہبی موقعوں اور تہواروں میں وہ ہمیشہ شامل ہوتا تھا۔ بچے بوڑھے سے بلا تمیز خندہ پیشانی سے بات کرتا تھا۔ گھر کے معاملات کی تفصیل پوچھنے میں اس کی ہمدردی و شرافت نہ تھکنے والی تھی۔ اس کے دوست مجبوراً اس کے مندرجہ ذیل قسم کے بیماروں کا سلسلہ اس کی زبان سے سننے کے لئے ٹھہر جاتے تھے۔

پیارے تمہیں مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ تم راضی ہونا؟ شانتی کا کیسا حال ہے؟ اور دادا کیسا ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے ابھی ابھی پتہ لگا ہے کہ مادھو کے

لڑکے کو بخار چڑھ گیا ہے۔ اب وہ کیسا ہے؟ اور ہری چرن بابو مجھے اسے ملے دیر ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ وہ بیمار نہیں ہے۔ رکھوالا کہاں ہے۔ اور کیسے ہے؟ اور وہاں تمہارے ہاں مستورات کا کیا حال ہے؟ خوش تو ہیں؟

کالی بابو ہر وقت اجلا اور صاف لباس پہنتا تھا۔ اگرچہ اس کے کپڑوں کا سٹاک بہت تھوڑا تھا۔ ہر روز وہ اپنی قمیض، واسکٹ، کوٹ اور پتلون، لحاف کمبل اور چھوٹی سی دری جس پر وہ بیٹھا کرتا تھا۔ دھوپ میں رکھتا تھا کہ خشک رہیں۔ جب ذرا ہوا لگ جاتی تو وہ انہیں ہلا کر برش سے جھاڑتا اور سنبھال کر رکھ لیتا تھا۔ اس کا تھوڑا سا فرنیچر (میز کرسی وغیرہ) کمرے کی قدرے آرائش کا باعث تھا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ ضرورت کے وقت اور بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اکثر جب کوئی نوکر موجود نہ ہوتا۔ تو تھوڑی دیر کے لیے وہ مکان بند کر دیتا۔ اور قمیض اور دوسرے کپڑے دھوپ میں سوکھنے ڈال دیتا۔ اور دیگر اسی قسم کے معمولی کام کرتا۔ جب یہ کر چکتا۔ تو دروازے کھول دیتا۔ اور پھر دوستوں سے جو ملاقات کے لیے آتے ملتا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اگرچہ کالی بابو تمام زمین ہاتھ سے کھو بیٹھا تھا۔ لیکن بزرگوں کی تھوڑی سی جائداد ابھی اس کے قبضے میں باقی تھی۔ منجملہ ان کے ایک خوشبودار پانی چھڑکنے کا چاندی کا گلاب دان۔ ایک عطردانی۔ جس پر مینا کاری ہوئی تھی۔ ایک سنہری طشتری ایک نایاب دوشالہ ایک پرانے زمانے کی خلعت اور ایک بزرگوں کی خاندانی پگڑی تھی۔ یہ چیزیں اس نے بمشکل قرض خواہوں کے پنجے سے چھڑائی تھیں۔ ہر ایک مناسب موقع پر وہ ان اشیا

کو سجا کر رکھتا۔ تاکہ سب دیکھ سکیں۔ اور بتیجور کے بابوؤں کا عز و وقار اور شان و شوکت جس کے لیئے ان کی ایک عالم میں شہرت تھی۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی تھوڑی بہت قائم رہ سکے۔

باطن اس کا نہایت صاف اور ایک حلیم الطبع انسان کا سا تھا۔ لیکن ظاہرا گفتگو میں وہ آزادانہ طور پر اپنے خاندان پر فخر و ناز کرنا اپنا ضروری بلکہ مقدس فرض سمجھتا تھا۔ اس کے دوست آشنا بھی اسے ایسا کرنے میں امداد دیتے تھے۔ اور اس شغل میں خوب حظ اڑاتے تھے۔

اڑوس پڑوس کے لوگ جلدی اسے ٹھاکر دادا کے نام سے پکارنے لگ گئے۔ وہ اس کے گھر میں جمع ہو جاتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ اس کا خرچ بچانے کے لیئے کالی بابو کا کوئی نہ کوئی دوست اس کے لئے تمباکو لے آتا اور کہتا۔

"ٹھاکر دادا! آج یہ تمباکو ہمارے ہاں گیا سے آیا ہے دیکھو تو سہی پینے میں کیسا ہے؟"

ٹھاکر دادا حقہ میں بھر کر پیتے اور کہتے۔

"بہت اچھا ہے۔"

پھر وہ کسی نفیس تمباکو کا جو اس کے بزرگ بتیجور میں پرانے وقتوں میں پیا کرتے تھے۔ اور جو ایک اشرفی کا ایک تولہ آتا تھا۔ ذکر چھیڑ دیتا تھا اور یوں شروع کرتا

"میں نہیں کہہ سکتا کہ حاضرین میں سے کسی کو وہ تمباکو پینے کا شوق ہے میرے

پاس تھوڑا سا موجود ہے۔ اور مبلد منگوا سکتا ہوں"۔
ہر ایک جانتا ہے کہ اگر وہ کہنے کہاں بٹیں گے تو کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ لینا
لازمی امر ہے۔ مثلاً کہ الماری کی چابی کھوئی گئی ہے۔ اور کہ ملازم گنیش کہیں رکھ
گیا ہے۔ کالی بابو کہا کرتا۔
"جس گھر میں نوکر ملازم ہیں۔ پتہ نہیں لگتا۔ چیز کہاں جاتی ہے۔ اب اس
گنیش کو ہی جس کی بے وقوفی میں بیان کرنے سے قاصر ہوں مے لیجئے۔ یہ ایسا
نالائق ہے۔ مگر میرا دل اجازت نہیں دیتا کہ اُسے برداشت کروں"۔
کالی بابو کے خاندان کی عزت کی خاطر گنیش ہر ایک الزام برداشت کرنے کو
تیار رہتا۔
ایسے موقعہ پر اکثر حاضرین میں سے ایک بول اُٹھتا۔
"ٹھاکر دادا! کچھ مضائقہ نہیں ڈھونڈنے کی تکلیف نہ کیجئے۔ جو تمباکو ہم پی رہے
ہیں کافی اچھا ہے تمہارے والا فرانسیز ہوگا"۔
اس پر کالی بابو کو ذرا اطمینان ہوتا۔ اور گفتگو اس مضمون پر ختم ہوکر اور اور مضامین
پر جاری رہتی ہے۔ جب مہمان جانے کے لئے اُٹھتے۔ ٹھاکر دادا دروازے
تک انہیں چھوڑنے جاتا۔ اور دہلیز پر کھڑا ہوکر کہتا
ہاں ایک بات رہ گئی۔ آپ لوگ میرے ہاں دعوت کب کھائیں گے؟
ہم میں سے کوئی جواب دیتا۔
"ٹھاکر دادا! ابھی نہیں پھر کبھی سہی"۔
بہت اچھا مناسب ہوگا اگر ہم موسم برسات تک انتظار کریں۔ ابھی بہت

گرمی ہے۔ آج کل کے موسم میں جیسی شاندار ضیافت کہ میں تم لوگوں کو دینی چاہتا ہوں ہاضمہ بگاڑ دے گی اور باعثِ نقصان ہوگی"

جب موسم برسات شروع ہو جاتا تو ہم اسے اس وعدے کی نسبت یاد نہیں دلاتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے یہ مضمون چھڑ جاتا تو کوئی دوست نرمی سے صلاح دیتا کہ جب بارش ہو رہی ہو۔ تو ادھر ادھر آنا جانا بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہو کہ برسات ختم ہو لینے دیں۔ اس طرح سے بازی جاری رہتی۔

بلحاظ اس کی حیثیت کے ٹھاکر دادا کا مکان بہت چھوٹا تھا۔ اور ہم اس معاملے میں اس سے ہمدردی کیا کرتے۔ اس کے دوست اسے یقین دلاتے کہ ہم تمہاری مشکلات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ کلکتے میں اچھے مکان کا ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دراصل برسوں وہ کالی بابو کے لئے ایک موزوں مکان تلاش کرتے رہے تھے۔ مگر شاید میرے لکھنے کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص اس کے لئے موزوں مکان حاصل کر لینے کی بے وقوفی کا مرتکب نہیں ہوا تھا ٹھنڈا سانس بھر کر اور یہ توکل خدا ٹھاکر دادا کہا کرتے تھے

"خیر آخر مجھے اسی مکان میں گزارہ کرنا پڑے گا۔ میرے لئے دوستوں کی جدائی برداشت کرنا ناممکن ہے تمہارا نزدیک موجود ہونا تمام مشکلات کا کفارہ کر دیتا ہے

اس کے بعد وہ مسکرا دیتے۔

بعض اوقات یہ باتیں میرے دل پر بہت گہرا اثر کرتیں۔ میں سوچتا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ جب ایک آدمی جوانی کی حالت میں ہوتا ہے۔ تو وہ احمقوں کی سی

باتیں کرنا کبیرہ گناہ خیال کرتا ہے۔ کالی بابو دراصل احمق یا بے وقوف نہیں تھا
معمولی لین دین اور کاروبار میں ہر ایک شخص کی صلاح لینا مناسب خیال نہیں کرتا
تھا۔ لیکن نینجور کی بابت اس کی گفتگو عقل سے بعید معلوم ہوتی تھی۔ چونکہ ظاہرا فقیہ
محبت جو ہم لوگوں کو اس سے تھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہم اس کے ناممکن الیقین
بیانات کے خلاف بولنے کے لئے لب کشائی کریں۔ اس لئے وہ گفتگو میں مناسب
حدود کے اندر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب لوگ اس کے سامنے نینجور کی شاندار
تواریخ مبالغہ آمیز مضحکہ خیز پیرایہ میں بیان کرتے تو وہ ہر ایک لفظ پر نہایت سنجیدگی
سے یقین کر لیتا۔ اور کبھی خواب میں بھی خیال نہ کرتا کہ کوئی شخص ان باتوں کو جھوٹا اور
اور ناقابل اعتبار سمجھ سکتا ہے۔

جب میں بیٹھ کر نہایت غور و خوض سے ان خیالات کو جو میرے دل میں بابو کی
نسبت تھے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ کالی بابو سے جو نفرت
مجھے ہے۔ اس کی زیادہ گہری وجہ یہ بھی تھی۔ اور یہ میں اب بیان کروں گا۔

اگرچہ میں ایک امیر باپ کا بیٹا ہوں اگر ہندوستانی کالج میں وقت اور روپیہ ضائع
کر سکتا تھا۔ لیکن میری محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ جب میں نوجوان ہی تھا میں نے کلکتہ یونیورسٹی
کی ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ میرا چال چلن نہایت اعلیٰ اور شک و شبہ سے بالاتر
تھا۔ دیکھنے میں خوش شکل اور وجیہہ تھا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں ایک خوبصورت جوان
تھا۔ تو یہ خود ستائی خیال کی جائے گی لیکن کوئی اسے جھوٹ خیال نہیں کر سکتا
تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میرے والدین کا خیال تھا کہ بنگال کے نوجوانوں

ہیں میں ایک نہایت قابل نوجوان بہ لحاظ شادی ہوں اس لحاظ سے مجھے اس کوئی شک نہ تھا اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ شادی کے بازار میں اپنی پوری قیمت پا کر چھوڑوں گا۔

جب میں نے یہ سوچا کہ میری پسند خاطر بیوی کیسی ہے تو میرے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک الدار صاحب حیثیت شخص کی لڑکی جو دیکھنے میں حسین ماہ جبیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی کہ تصویر کھنچ گئی۔

ہر جانب دور دور دیکھ سے منگنی کی تجویزیں آنے لگیں۔ انہوں نے بھاری نقد رقمیں پیش کیں میں نے یہ پیشکش سختی سے بلا کم وکاست اور بلا رد و رعایت اپنی عقل کی ترازو میں تولیں تو ایک بھی نہ نکلی جسے اپنا عمر کا ساتھی بنانے کے قابل سمجھتا۔ بھاجوتی شاعر کے الفاظ میں مجھے یقین ہو گیا کہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے کہ اس دنیا میں جو وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہے۔ ایسی لڑکی پیدا ہو جائے۔ جو میری شانہ عزت کی شریک ہونے کی مستحق کہلا سکے۔ مگر موجودہ زمانے میں آج کل کے بنگال کے چھوٹے سے قطعہ زمین میں ایسی بے مثل لڑکی کا پیدا ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور دکھائی دیتا تھا۔

اس اثنا میں وہ والدین جو مجھ پہ نظر رکھتے تھے ہر طرح سے میری صفتوں کے راگ گاتے رہے۔ اور میری تعریفوں کے پل باندھتے رہے میں یہ تعریف اپنا حق تصور کیا کرتا تھا۔ کیونکہ میں اپنے خیال میں ایسا نیک تھا۔ کہتے ہیں کہ جب دیوتا ہمہ دانی انسانوں کو اپنی بخششوں سے محروم رکھتے ہیں تو ان کا عقیدہ تمندی سے اقرار کریں۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو دیوتا لوگ ناراض ہو جاتے ہیں میرے

دل میں بھی یہ دیوتاؤں جیسی خراج تحسین و آفرین وصول کرنے کی خواہش جاگزیں ہو گئی تھی۔

میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھاکر داد کی ایک اکلوتی پوتی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو اکثر دیکھا تھا۔ مگر کبھی خیال نہیں کیا تھا کہ وہ خوبصورت ہے۔ میرے دل میں بھی خیال تک نہ گزرا تھا کہ وہ میری ہمراز و غمگسار بن سکتی ہے۔ باوجود اس کے مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن کالی بابو مجھ سے ضرور درخواست کرے گا کہ میں اس کا ناچیز تحفہ یعنی اس کی پوتی قبول کر دوں۔ در اصل کالی بابو سے میری اندرونی نفرت کا یہی راز تھا۔ میرے دل میں سخت غصہ تھا کہ اس نے ابھی تک کیوں ایسا نہیں کہا ہے۔

میں نے سنا تھا کہ دادا نے اپنے دوستوں سے کہا ہے کہ نینجور کے بابو کسی سے کوئی درخواست نہیں کیا کرتے۔ خواہ لڑکی کنواری رہے۔ وہ خاندان کی آن نہیں چھوڑتے۔ ہاں یہ میرے لئے ناممکن تھا کہ صرف اپنے غصے کے اظہار کی خاطر اس ضعیف شخص کو سزا دوں اور بہت عرصہ تک میں نے کچھ نہ کچھ نہ کہا سنا۔ مگر اچانک ایک روز مجھے ایک ایسی عجیب سی تجویز سوجھی کہ میں اسے عمل میں لانے کی خواہش کو نہ روک سکا۔

پیشتر ذکر ہو چکا ہے کہ کالی بابو کے دوست اس کی تعریفوں کے پل باندھ باندھ کر اسے پھلا دیتے تھے۔ ایک دوست نے جو ریٹائرڈ ملازم گورنمنٹ تھا۔ اسے کہا تھا کہ جب کبھی میں چھوٹے لاٹ صاحب سے ملتا ہوں تو وہ نینجور کے بابوؤں کی بابت ضرور تازہ خبر دریافت کرتے ہیں اور سنا ہے کہ چھوٹے لاٹ صاحب کہتے

ہیں کہ تمام بنگال میں حقیقی معزز خاندان مہاراجہ کالی پور اور رینجور کے بابوؤں کے ہیں۔ جب کالی بابو نے یہ سفید جھوٹ سنا تو اسے بڑا فخر ہوا۔ اور اکثر یہ کہانی دُہرایا کرتا۔ اس کے بعد جب کبھی اس شخص سے ملتا تو علاوہ اور باتوں کے یہ ضرور پوچھتا "کہو چھوٹے لاٹ صاحب کیسے ہیں!؟ مجھے یہ سُنکر بڑی خوشی ہوگی کہ وہ اچھی طرح ہیں اور میم صاحب کا کیا حال ہے؟ اور ننھے بچے! یہ بڑی خوشخبری ہے ان سے جب تم ملو تو میرا سلام ضرور کہنا!"

کالی بابو اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ لاٹ صاحب سے ملاقات کر دں۔ مگر یہ فرض کرنے میں ہم میں کوئی تامل نہیں کہ کئی بڑے اور کئی چھوٹے لاٹ آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ پیشتر اس کے کہ کالی بابو اپنی خاندانی بگھی آراستہ کر کے گورنمنٹ ہاؤس کی جانب روانہ ہو سکے گا۔

ایک روز کالی بابو کو ایک طرف لے جا کر میں نے اس کے کان میں کہا۔ "ٹھاکر دادا۔ کل میں لاٹ صاحب کے ہاں دعوت کے موقع پر حاضر تھا۔ وہ تمہارا ذکر کرتے تھے!"

میں نے کہا۔ "کالی بابو کلکتہ چلے آئے ہیں"۔

"انہیں اس بات کا سخت رنج ہے کہ آپ نے ان سے ملاقات نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تمام رسمی تکلف کو بالائے طاق رکھ کر آج شام کالی بابو سے ان کے مکان پر خود پرائیویٹ طور پر ملاقات کرنے کی غرض سے آئیں گے۔"

کوئی اور شخص ہوتا تو ایک منٹ میں میری شرارت تاڑ جاتا اور اگر یہ دیدہ دانستہ کسی اور شخص سے کہا جاتا تو بھی کالی بابو فوراً سمجھ جاتا۔ مگر چونکہ اپنے دوست

کی زبانی جو ملازم دفتر سرکاری تھے بہت گنیش پہنچ چکے تھے۔ اور خود بھی خوب مبالغہ آمیز گپیں اڑا چکے تھے۔ اس لئے انہیں لفٹیننٹ گورنر کا ان کے گھر چل کر آتا۔ ایسا معلوم ہوا کہ مبالغہ سے بری ہے۔ اور عین اغلب بلکہ درست ہے یہ خبر سن کر کالی بابو قدرے گھبرا گیا۔ لاٹ صاحب کی ملاقات کی ہر ایک تفصیل کے متعلق اسے فکر دامن گیر ہوئی۔ خاص کر انگریزی زبان سے اپنی ناآشنائی کے متعلق اسے بہت فکر ہوا۔

"کہ اس مشکل کا کیا علاج کیا جائے"

"یہ کوئی تشویش کا باعث نہیں ہے آپ گھبرائیے نہیں۔ انگریزی زبان سے ناواقف ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ایک عالی و معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں علاوہ ازیں لاٹ صاحب ہمیشہ ایک مترجم ہمراہ رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے خاص طور پر ذکر فرمایا ہے کہ یہ ملاقات پرائیویٹ ہوگی۔

. . . .

دوپہر کے قریب جب تمام پڑوسی یا تو اپنے کام میں مصروف تھے یا۔۔۔ رہے تھے۔ کالی بابو کے مکان کے سامنے ایک گاڑی آکر ٹھہری دو باوردی سپاہی سیڑھیاں چڑھ آئے اور بلند آواز سے بولے۔

"چھوٹے لارڈ صاحب حضور!"

پرانے دبدبے کی علامت اور دیگر لباس زیب تن کئے اور خاندانی دوپٹہ پہنے کالی بابو استقبال کے لئے تیار رکھا ملازم گنیش بھی اپنے مالک۔۔۔ کے نفیس ترین اترے پہنے اس موقعہ کے لئے تیار کھڑا تھا۔

جب چھوٹے لاٹ صاحب کے آنے کا اعلان ہوا تو مرزاں وزیر بہا
ہونکتے ہوئے دروازے تک دوڑ کر آئے اور بار بار سلام بجا لا کر میرے ایک
دوست کو جس نے لاٹ صاحب کا بھیس بدلا ہوا تھا۔ استقبال کر کے اندر لائے
ہر ایک سیڑھی پر جھک کر سلام کرتے ۔ اور اسی انداز سے واپس آئے لکڑی کی
ایک کرسی پر اپنے آباؤ اجداد کا خاندانی دوشالا بچھا رکھا تھا۔ اور لاٹ صاحب
سے درخواست کی کہ تشریف رکھیں۔ جب یہ ہو چکا۔ تو کالی بابو نے اردو زبان میں جو
صاحب لوگوں کی قدیمی درباری زبان ہے ایک برجستہ تقریر کی۔ معہ نے کی طشتری
پر اشرفیوں کی لڑی رکھ کر بطور نذرانہ پیش کی یہ اشیاء اس کے بزرگوں کی
بچت کھچت تھیں۔

گنیش داس جس کے چہرے پر خوف دہراس نمایاں تھا گلاب دانی ہاتھ میں
لئے ہوئے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے اتنا گلاب چھڑکا کہ لاٹ صاحب تر بتر ہو گئے۔
اور عطر دانی میں سے بار بار ان کے کپڑے معطر کرتا جاتا تھا۔

کالی بابو افسوس ظاہر کرتا تھا "میں حضور کا استقبال ہمارے خاندان
کی پرانی روایات اور شان کے مطابق کرنے میں قاصر رہا ہوں اگر حضور کا شرف
ملاقات منیجور میں حاصل ہوتا تو میں یقیناً پوری کر دفر سے حضور کا استقبال بجا
لاتا یہاں کلکتہ میں میں ایک اجنبی شخص ہوں۔ یہاں تو بعینہ ایسی حالت ہے جیسا کہ
ایک مچھلی کی حالت پانی سے باہر ہوتی ہے "۔

میرے دوست نے جو سر پر بلند ریشمی انگریزی ٹوپی پہنے ہوئے تھا سر ہلا کر
ہاں میں جواب دیا۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہیں انگریزی رواج

کے مطابق کمرے کے اندر داخل ہوتے وقت ٹوپی اتار کر رکھ دینا چاہئیے تھی۔ مگر
دوست ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اور مبادا بھانڈا پھوٹ جائے
اور ملاقات کی رسم کی یہ خلاف ورزی کالی بابو اور گنیش کے تو خواب وخیال میں
کبھی بھی نہیں آسکتی تھی۔ ان کے خیالات کی بلند پروازی بھلا ادھر کیسے راغب
ہو سکتی تھی۔ دس منٹ کی ملاقات کے بعد جس کے دوران میں میرا دوست یعنی
فرضی راجہ صاحب صرف سر ہلاتا رہا۔ وہ چلنے کے لیئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسا کہ پہلے
ہی طے ہو چکا تھا۔ دونوں باوردی بیارے اشرفیوں کی بڑی سونے کی طشتری
خاندان کا پرانا دوشالہ۔ چاندی کا گلاب دان اور عطر دان اٹھا کر لے گئے اور
پرتکلف طریقے سے گاڑی میں رکھ دیئے۔ کالی بابو نے خیال کیا کہ چھوٹے لاٹ
صاحب کا ایسا ہی دستور ہوتا ہے۔

ساتھ کے کمرے میں سے میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ہنسی کو روک رکھنے
کی وجہ سے میری پسلیوں میں درد ہو رہا تھا۔ جب مجھ سے زیادہ ضبط کی طاقت
نہ رہی تو میں اس سے لگے کمرے میں بھاگ گیا۔ اور اچانک دیکھا کہ ایک کونے میں
کھڑی ایک لڑکی ہچکیاں لے لے کر رو رہی ہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے
دل کو کوئی صدمہ پہنچا ہے جب اس نے مجھے بلند آواز سے ہنستے دیکھا تو گھبرا کر وہ
بے حس و حرکت کھڑی رہی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی روشنی نکل کر میری
آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ آخر آنسوؤں سے رکی ہوئی آواز میں بولی۔

میرے باباجی نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے تم کیوں انہیں دھوکہ دینے آئے
ہو یہاں کس غرض سے آئے ہو؟

اس سے زیادہ وہ بول سکی۔ اور ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر پھر رونے لگ پڑی۔

یہ دیکھ کر میری ہنسی جھٹ رک پڑی۔ مجھے یہ کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا تھا وہ ایک نہایت مزے دار مذاق سے زیادہ ہے مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس معصوم لڑکی کے دل کو ٹھیس لگائی ہے۔ اور تکلیف پہنچائی ہے۔ میرا یہ ظالمانہ فعل مجھے بھدی سے بھدی شکل میں دکھائی دینے لگا۔ اور زبان حال سے پکار اٹھا کہ میں مجرم ہوں۔

اب تک کالی بابو کی پوتی کُسم کے متعلق اگر میرے دل میں کوئی خیال تھا تو وہ یہ تھا کہ شادی کے بازار میں اس کا کوئی خریدار نہیں ہے اور کہ اس کے لئے خاوند کی تلاش فضول ہے۔ مگر اب مجھے دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اسی کمرے کے کونے میں ایک انسانی دل حرکت کر رہا ہے۔

تمام رات مجھے بہت کم نیند آئی۔ میرے دل کے اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اگلے روز علی الصبح ہی تمام مال مسروقہ لے کر میں کالی بابو کی جائے رہائش کی جانب روانہ ہو گیا۔ تاکہ پوشیدہ طور سے سب کچھ گنیش کے حوالے کر دوں۔ دروازے کے باہر میں نے کچھ عرصہ انتظار کی مگر جب کوئی نظر نہ پڑا۔ تو کالی بابو کے کمرے میں جانے کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا دروازے کے باہر میرے کان میں آواز پڑی کہ کُسم اپنے دادا سے یوں سوال کر رہی ہے۔

"دادا جی بڑے لاٹ صاحب نے کل جو کچھ تمہیں کہا ہے مجھے بتاؤ۔ ایک ایک لفظ بتاؤ۔ میں یہ تمام حال سننے کی از حد مشتاق ہوں"

کالی بابو کو مزید اکساہٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ فخر سے تمتما
رہا تھا جب اس نے تمام تعریفی کلمات جو لاٹ صاحب نے ہنجہ رکے قدیمی
خاندان کی بابت کہے تھے۔ سنائے۔ لڑکی اس کے سامنے بیٹھی اس کے منہ کی
طرف دیکھ رہی تھی اور ہر ایک لفظ پوری توجہ سے سُن رہی تھی۔ دادا کے لئے
جو اسے محبت تھی۔ وہ تقاضا کرتی تھی کہ وہ اپنا پارٹ اس انداز سے ادا کرے
کہ اس کے دادا کے دل میں کوئی شک نہ اُٹھنے پائے۔

میرا دل متاثر ہوا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے جب تھا کہ دادا
چھوٹے لاٹ صاحب کی آمد اور عجیب و غریب ملاقات کے متعلق اپنا بیان
ختم کر چکا تو میں ابھی باہر کھڑا تھا۔ آخر جب کالی بابو کمرے سے چلا گیا تو
اندر جا کر میں نے تمام مسروقہ مال لڑکی کے قدموں پر رکھ دیا اور بغیر کوئی بات
کہے باہر چلا آیا۔

کچھ تھوڑے ہی دن گئے میں پھر ملنے آیا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں یہ بُرا رواج ہے
میری عادت تھی کہ جب اس ضعیف شخص کے کمرے میں داخل ہوتا کوئی سلام
بندگی نہیں کیا کرتا تھا۔ مگر آج جھک کر میں نے نمسکار کیا اور چرن چھوئے
مجھے یقین ہے کہ کالی بابو نے خیال کیا ہوگا۔ کہ میری نئی خوش خلقی کا باعث
چھوٹے لاٹ صاحب کی ملاقات ہے۔ وہ میرے نمسکار کرنے سے بہت
خوش ہوا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک قسم کا جلال ٹپک رہا تھا۔
اس کے چند دوست آئے ہوئے تھے۔ اور لفٹیننٹ گورنر کی آمد کا قصہ
پہلے سے بھی زیادہ حاشیہ آرائی اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا تھا

اس ملاقات کی کہانی پہلے ہی کیا بہ لحاظ نوعیت اور کیا بہ لحاظ طوالت رزمیہ کہانی بنی شروع ہو گئی تھی۔

جب باقی کے تمام ملاقاتی چل دیے تو میں نے بدیں الفاظ نہایت عاجزی سے اپنی شادی کے متعلق ارادہ ظاہر کیا۔

"اگرچہ میں ایک منٹ کے لیے بھی یہ امید نہیں کر سکتا کہ میں بذریعہ شادی ایسے عالی خاندان سے رشتہ جوڑ سکوں۔ پھر بھی ...."

جب میں نے اپنا مطلب صاف صاف بیان کیا تو بوڑھا مجھ سے بغل گیر ہوا اور فرط انبساط کی حالت میں بولا۔

"میں تو ایک غریب شخص ہوں مجھے امید نہیں تھی کہ میری قسمت ایسی اچھی ہے"۔

کالی بابو کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقعہ تھا کہ اس نے اپنی مفلسی کا اقبال کیا۔ اور یہی اس کی زندگی کا پہلا اور آخری موقعہ تھا کہ جب اس نے ..... کے بابوؤں کی جاہ و حشمت بھلا دی خواہ ایک لمحہ کے لیے ہی

بے قرار

"ڈاکٹر ــــــ ڈاکٹر"

"کون ہے؟ اس آدھی رات میں پریشان کر ڈالا"

یہ کہہ کر میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اور دیکھا۔ ہماری گلی کے شاماں چرن بندوبست کمشنر تھے۔ میں انہیں باعزت اندر لے گیا۔ ایک آرام کرسی پر بٹھا کر کلاک پر نگاہ ڈالی ٹھیک اڑھائی بجے تھے۔

بابو شاماں چرن کا چہرا اترا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کا خوف پوشیدہ معلوم ہوتا تھا۔ چند سیکنڈ ٹھہر کر انہوں نے کہنا شروع کیا

"ڈاکٹر صاحب! آپ کی دوا بالکل بے کار ثابت ہوئی۔ آج شب کو بیماری پھر شروع ہونے لگی ہے اور اس کا زور پکڑ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔"

"شاید آپ نے پھر شراب پی لی ہو؟" میں نے ان کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

میرے اس سوال پر وہ کچھ دیر چپ رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سوچ رہے ہیں آخر ان کا چہرہ کچھ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔

"ڈاکٹر! بلاشبہ تم سمجھدار ہو۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس معاملے میں تمہاری عقل بالکل کام نہیں کرتی۔ میری یہ حالت بوجہ شراب نہیں اس کا دوسرا ہی سبب ہے۔ اس سے پیشتر کہ تم اپنی کوئی رائے قائم کرو پہلے میری داستان سن لو۔ پھر شاید تم کچھ سوچنے کے قابل ہو سکو۔"

سامنے طاق پر مٹی کے تیل کا چراغ روشن تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے تیز کر دیا۔ روشنی کو زیادہ ہو گئی۔ مگر ساتھ ہی دھواں بھی خوب نکلنے لگا۔ اس کے بعد میں شاماچرن بابو کی طرف متوجہ ہوا۔ انہوں نے اپنی داستان اس طرح بیان کی۔

"کوئی چار سال کا عرصہ ہوا جب مجھے ایک خوفناک بیماری ہوئی اور میری حالت دگرگوں ہو گئی۔ یہاں تک کہ میں موت کے قریب پہنچ گیا۔ سب ڈاکٹر جواب دے چکے۔ میری خوش قسمتی سمجھئے یا بد قسمتی انہیں

دلوں ایک سنیاسی یہاں آ گئے۔ انہوں نے دوائی دی۔ میرے مرض نے پیٹا کھایا۔ صحت میں کچھ تبدیلی نظر آنے لگی۔ مگر مکمل آرام میں ایک ماہ لگ گیا۔ لیکن کمزوری آج تک دور نہیں ہو سکی۔

دوران علالت میں میری بیوی کو نہ دن کو چین تھا نہ شب کو آرام وہ ہر وقت میری تیمار داری میں لگی رہتی تھی۔ نزیدا گو کمزور تھی اور ملک الموت سے مقابلہ کرنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ مگر پھر بھی اس نے اسے شکست دی۔ فرشتۂ اجل جو ہمارے گھر میں داخل ہو کر میرے پلنگ پر آ بیٹھا تھا۔ اسے مار بھگایا کیونکہ اسے ایک منٹ کے لئے بھی اطمینان میسر نہ تھا۔ اس لئے اس کے کھانے پینے میں بھی دیر ہونے لگی۔ کبھی کبھی تمام دن بغیر کھائے ہی بیت جاتا۔ ہر وقت میری صحت کا خیال اس کے دماغ میں شعلہ زن تھا۔ وہ دنیا کی تمام لذتوں سے دور ہو چکی تھی۔ جب دیکھتا کرسی پر میرے سرہانے بیٹھی ہوتی۔ اپنے مہیب حریف سے شکست کھا کر موت کے قاصد کو بھاگنا ہی پڑا۔ مگر جاتے وقت اس نے ایک ایسی چپت جمائی کہ میری بیوی اس کی تاب نہ لا سکی۔ میری جگہ وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔

چند سیکنڈ کے لئے میونسپل کمشنر صاحب ٹھیر گئے۔

ان دنوں وہ حاملہ تھی۔ چار ماہ کے بعد مردہ لڑکا پیدا ہوا اب تیمارداری کی میری باری تھی۔ باوجودیکہ وہ خود بیمار تھی۔ اسے میری کمزوری کا خیال دامن گیر تھا۔ ایک دن اسی کرسی پہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

کہ اس نے کہا۔

"آپ میرے کمرے میں نہ آیا کریں۔ ابھی تک آپ کی کمزوری دُور نہیں ہوئی۔ ابھی بہت آرام کی ضرورت ہے"۔

"نہیں اب مجھے کوئی تکلیف نہیں"۔

اسی طرح ایک بار بخار کے وقت میں اسے پنکھا کر رہا تھا تو اس نے کچھ خفا ہو کر کہا۔

"آپ کی ایسی باتیں مجھے اس کی خدمت میں لگا ہی رہنا پڑا۔ آپ نے باغیچہ والا وسیع مکان ضرور دیکھا ہو گا جو لبِ دریا واقع ہے۔ اس باغ میں ایک چھوٹی سی بچہ... اور میری بیوی نے بنوائی تھی۔ اس کے عین درمیان میں ایک سنگِ مرمر کا چبوترا بنوایا تھا۔ کام کاج سے فارغ ہو کر وہ روزانہ وہاں بیٹھی اور دل بہلاتی وہاں سے قلعے کا مینار، دریا میں سیر کرنے والی بادبانی کشتیاں اور سڑک سے گزرنے والے مسافر صاف نظر آتے ہیں مگر وہاں بیٹھا ہوا شخص سب کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکتا ہے گرمیوں کے دن تھے۔ اور رات کا وقت۔ تمام باغ میں چاندنی رقصاں تھی۔ طویل علالت کے بعد آج زبیدا کی طبیعت کچھ اچھی تھی۔ وہ میرا سہارا لئے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آئی۔ اور اسی چبوترے پر بیٹھنے کا ارادہ تھا۔ پیار میں نے اسے نہایت آہستگی سے وہاں لا بٹھایا جس کا سفید سنگِ مرمر چاندنی میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا

ہوا چل رہی تھی۔ اس کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پھولوں کی پتیاں

چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ چاندنی نے بدا کے مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑ کر اسے اور بھی زیادہ زرد کر رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں اس وقت اپنی بیوی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی طرف دیکھ رہا تھا نسیم پھولوں کی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔

"میں تمہیں ہرگز نہیں بھول سکتی"۔

وہ مسکرائی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ طنزاً ہنس رہی ہے۔ اس نے جواب نہ دیا۔ شاید اپنی مسکراہٹ سے مجھے سب کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔ میں نے دیکھ کہا وہ اسے ضرور غلط سمجھ رہی تھی جب وہ میرے پاس نہیں تھی تو سینکڑوں خیال دل میں اُٹھ رہے تھے۔ اور اسے اپنی بے حد محبت دکھانے کے لئے میں نے ایک ادبی مضمون اپنے دماغ میں مرتب کیا تھا۔ مگر مقابل آتے ہی جیسے قوت گویائی سلب ہو گئی ہو اگر وہ میری اس بات پر اعتراض کا کوئی لفظ زبان پر لاتی تو میں ضرور بحث کر کے فتح حاصل کر سکتا تھا۔ مگر جب مسکرا کر اس نے میرا مذاق اڑانا چاہا تو پھر زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ شاید ناظرین بھی کبھی بار اس حالت سے گزرے ہوں آہستہ آہستہ شہر کے تمام ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ مسلسل کئی ماہ علاج کے باوجود بھی اس کی صحت میں تبدیلی نہ ہوئی بیماری ہر قدم پر بڑھ رہی تھی۔ کمزوری ہر روز زیادہ ہو رہی تھی۔ آخر بڑے ڈاکٹر نے تبدیلیٔ آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ یہ بات مجھے بہت پسند آئی۔ میں اسے الہ آباد لے گیا۔

شاما چرن یکایک ٹھہر گئے۔ اور معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے

پھر کسی مریض کی طرح اپنے سر کو تھام لیا۔ جیسے تھک گئے ہوں۔ سامنے رکھا ہوا چراغ پھر مدھم ہو گیا۔ مگر مچھروں کی تنگ کرنے والی بھنبھناہٹ تیز ہو گئی۔

اس وقت وہ ڈاکٹر نارائن کے زیرِ علاج تھی۔ مگر چند دن بعد ہی اس نے بھی جواب دے دیا۔ دوسرے دن وہ پھر اُسے دیکھنے کے لئے آئے اور ایک علیحدہ کمرے میں مجھے لے جا کر کہنے لگے۔

مریض کی حالت اچھی نہیں۔ بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی ہے مجھے تو صحت کی بالکل امید نہیں شاید زندگی کے خاتمہ پر ہی بیماری کی تکالیف ختم ہوں اگر آپ کہیں تو میں کل نہ آؤں؟"

"ایسی بات نہ کہیں مجھے صرف آپ پر امید ہے۔"

"مگر اب میرے اختیار کی بات نہیں رہی۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس بات کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا۔ کہ میری بیوی نے ایک دن شام کو مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"مجھے اب آرام کی کوئی امید نہیں اور ساتھ ہی موت بھی قریب نہیں آنا چاہتی آپ ایک لاش کے ساتھ اپنی زندگی کو کیوں وابستہ کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ اپنے آفس کے کام کی طرف متوجہ ہوں گے۔"

میں نے تمام خیالات اور خدمات اپنے دماغ میں جمع کر لئے۔ پھر ایک خاص انداز سے کہا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا جب تک اس کا جسم۔۔۔۔۔"

"بس میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں اور کہنے کی ضرورت نہیں"۔
"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
میں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ مگر آج محسوس کر رہا ہوں کہ واقعی میں اس کی نہ ختم ہونے والی تیمارداری سے تنگ آ گیا تھا کیونکہ اس کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔
آج میں ان باتوں کو سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے اس نے میرے ان دلی خیالات کو بھانپ لیا تھا۔ اس وقت شاید میں اس کی یہ بات نہ سمجھ سکا۔
نارائن میرے مخلص دوست تھے۔ دوران آمد و رفت میں انہوں نے اپنی لڑکی سے میری ملاقات کرا دی تھی اس کی عمر سولہ سترہ سال کے درمیان تھی۔ وہ بلا کی ذہین اور سمجھ دار تھی۔ اور تھی بھی ابھی کنواری۔ ڈاکٹر کہتا تھا۔ کہ کوئی لائق لڑکا نہیں ملا۔ اس لئے شادی نہیں ہو سکی۔ مگر یہ افواہ عام تھی۔ کہ اس کی جنم پتری میں کچھ کمی واقعہ ہے۔ اس لئے شادی نہ ہو سکی باوجود اس افواہ کے اس میں ظاہری نقص نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ اور روزمرہ کی ملاقات نے اس کے حسن نے مجھے اپنی طرف راغب بھی کر لیا تھا۔ اس کی تعلیم ایف۔ اے تک تھی۔ اکثر بحث مباحثہ میں میں نے اس کی دانشمندی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اب مجھے ڈاکٹر کے گھر زیادہ دیر بیٹھنا پڑتا۔ اور وہ دیر کبھی کبھی اتنی طویل ہوتی کہ مریضہ کو دوائی پلانے کا وقت بھی گزر جاتا۔ میری بیوی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ میں کہا جاتا ہوں مگر اس نے کبھی مجھے جتایا نہیں اور نہ اس دیر کی وجہ ہی دریافت کی۔ میں آتا تو وہ

میرے چہرے کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔

اب مجھے آہستہ آہستہ بیمار کے کمرے سے نفرت ہونے لگی پہلے جو کمرہ میرے لئے باعث مسرت تھا اب غم کا گھر بن گیا۔ بارہا دوائی پلانے کا خیال بھول جاتا ایک روز ڈاکٹر نے مجھے کہا

عموماً خطرناک بیماریوں سے نجات موت کے بعد ہی ملا کرتی ہے رکیونکہ زندگی میں تو انہیں خوشی حاصل ہو ہی نہیں سکتی بلکہ ان کی زندگی تیمارداروں کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہو جاتی ہے۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا کیونکہ یہی الفاظ اگر کسی دوسرے کے لئے ہوتے تو شاید قابل معافی ہو سکتے۔ اگر میرے ہی سامنے میری بیمار بیوی کی مثال رکھ کر یہ کہنا کہاں تک مناسب تھا۔ دوسرے ہی دن ڈاکٹر مریضہ سے یہ کہہ رہا تھا۔

"نہیں جلد اچھی ہو جاؤ گی"۔

اس سے پیشتر ان میں کیا کیا باتیں ہوئیں یہ میں نہیں جانتا۔ مگر اس کے جواب میں میری بیوی نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب یہ بات آپ کے دل سے نہیں نکل رہی بلکہ بناوٹی ہے اور فضول مجھے کڑوی میٹھی دوائیں پلا پلا کر تنگ کر رہے ہیں یہ تو آپ جانتے ہیں اور میں بھی کہ اب اس بیماری سے چھٹکارا موت سے پیشتر نہیں مل سکتا اگر آپ مناسب خیال کریں تو خود اپنے ہاتھ سے میری زندگی کا خاتمہ کر دیں"۔

"اس فیاض قدرت کے دروازے سے اس قدر ناامید لوٹنا ایک عقلمند

انسان کا کام نہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں عنقریب صحت ہو جائے گی"۔
یہ کہہ کر ڈاکٹر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور اس کے بعد میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پلنگ پر سرہانے بیٹھ گیا۔ پھر اپنا سرد ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ اس نے پُر معنی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور نہایت نرم لہجہ میں کہا۔
"اس وقت یہاں بہت گرمی ہے آپ کہیں باہر ہوا خوری کے لئے چلے جائیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو بھی تکلیف ہو جائے اور دوائی پلانے والا بھی کوئی نہ رہے"۔
اس ہوا خوری کا مطلب میں اور وہ ہم دونوں بخوبی سمجھتے تھے۔ کیونکہ میں روزانہ شام کو ڈاکٹر کے گھر جاتا تھا۔ جسے وہ جانتی تھی۔ اور ساتھ ہی میں نے چند دن پہلے اسے یہ کہا تھا۔
"صحت کو برقرار رکھنے کے لئے صبح اور شام ہوا خوری لازمی ہے"
میں سمجھتا تھا کہ عورت بے وقوف ہوتی ہے مگر یہ میری بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ وہ میرے ہر بہانے کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ میری ہر ناممکن بات کی تہہ تک پہنچ کر نتیجہ اخذ کر لیتی تھی۔ آج جب میں اتنے دنوں بعد ہر بات سوچتا ہوں تو واقعی ان دنوں میرا دماغ ٹھیک نہ تھا شاید عشق کا بھوت مجھ پر سوار تھا اور اس کی وجہ سے میری عقل پہ پردہ سا پڑ گیا ہو۔ اچھا خیر اب میں اصل مطلب کی طرف آتا ہوں۔
ایک روز ڈاکٹر کی لڑکی نے میری بیوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی

اس نے ایسا کیوں کیا کہ میں نہیں جانتا ۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کی یہ بات مجھے کچھ ناگوار گزری ۔ مگر باوجود اس بات کے یہ دیکھ بھی کیا شی کہ میں اُسے گھر آنے سے روکتا اور ساتھ میں ایسا بھی نہ کر سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک دن میرے مکان پر آ ہی گئی ۔ ——— "پہلے مجھے ایک گلاس پانی دے دو گلا خشک ہو رہا ہے"۔

پاس ہی صراحی میں پانی پڑا تھا ۔ میں نے ایک بلوری گلاس میں پانی دیا پینے کے بعد انہوں نے پھر کہانی شروع کی ۔

اتفاق سمجھو یا کچھ اور اس دن زہرا کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ بے چین تھی ۔ اس تکلیف کی وجہ سے اس کے ہاتھ کی مٹھیاں بند ہو گئی تھیں اس وقت جو بھی کوئی اسے دیکھتا بخوبی سمجھ سکتا تھا ۔ کہ اسے بہت درد ہو رہا ہے ۔ آج اس کی کمزوری نے طاقت گویائی بھی سلب کر دی تھی ۔ شاید اس وجہ سے اس نے مجھے ہوا خوری کے لئے بھی نہ کہا ۔ شاید وہ میری موجودگی اپنے قلب کی تسکین خیال کر رہی تھی ۔ بالکل مدہم سا چراغ میں نے دروازے کے قریب جلا دیا تھا ۔ مبادا زیادہ روشنی سے مریضہ کو تکلیف نہ ہو اس لئے کمرے میں دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ جس سے ہر چیز نمایاں طور پر نظر نہ آتی تھی ۔ تمام مکان میں بالکل سناٹا تھا ۔ صرف مریضہ کے کمرے میں کراہنے یا آہ سرد بھرنے کی آواز پیدا ہو رہی تھی ۔ یکایک روپ لیکھا دروازے پر نمودار ہوئی ۔ اور اندر میں ٹھٹھک کر وہیں کھڑی رہی ۔ چراغ کی دھندلی روشنی ٹھیک اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی ۔ جس سے اس کا چہرہ کچھ نمایاں کچھ تاریک تھا

نظر آرہا تھا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اور آنکھیں جھکا لیں۔ زبیدا
پانچ منٹ تک بچشمِ حیرت اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بعد میں میرے
چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کون ہے؟"

اس حالت میں شام کے وقت وہ اپنے مکان میں ایک نووارد
دوشیزہ کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ اور اب میری خاموشی کو دیکھ کر بار بار
سوال کرنے لگی۔

"وہ کون ہے ا—— کون ہے —— کیا نہیں بتاؤ گے۔
—— کچھ تو بتا دو کہ کون آیا ہے؟"

پہلے تو میں نے نہایت نرم آواز میں جواب دیا
"مجھے کیا معلوم!"

اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے دل کو پکڑ کر
ہاتھوں سے مسل رہا ہے۔ اس وقت خیال پیدا ہوا۔ کہ میں اپنی وفا
شعار بیوی سے دھوکہ کر رہا ہوں۔ پھر میں نے دل کو مضبوط کر کے
جواب دیا۔

"کیا تم نہیں جانتی ہاں ٹھیک ہے تم نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا
یہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کی لڑکی روپ لیکھا ہے۔"

زبیدا کی نظر یکایک میرے چہرے پر تھیں مگر مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی
کہ اس کی طرف دیکھتا۔ مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر اس نے روپ لیکھا

کی طرف دیکھا۔ اور اپنی تمام قوت یک جا کر کے شیریں لہجہ میں بولی۔
"یہاں آؤ — تم ذرا روشنی نزدیک لے آؤ۔"

میں نے فوراً تعمیل کی۔ ان دونوں میں آہستہ آہستہ چند باتیں ہوئیں اتنے میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اور بولا

"یہ دو شیشیاں ہیں۔ ایک کالی اور دوسری سفید۔ کالی شیشی کی دوا جسم پر مالش کے لئے ہے۔ اور سفید شیشی کی چار خوراک پینے کے لئے احتیاط سے کام لینا مبادا دوا تبدیل ہو جائے۔ کیونکہ کالی شیشی میں پوائزن ہے"۔

اس نے دونوں شیشیاں چارپائی کے پاس پڑی تپائی پر رکھ دیں پھر روپ لیکھا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آؤ چلیں"۔

روپ لیکھا نے کمرے کے چاروں طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "میرا خیال ہے۔ میں یہاں رہوں کیونکہ تیمارداری کے لئے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کوئی جواب دیتا میری [illegible] نے کہا۔
"نہیں تمہارے یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس خادمہ ہے۔ جو اس وقت باہر کسی کام کے لئے گئی ہے"۔

ڈاکٹر لڑکی کو اپنے ساتھ لے چلا تو نربدا نے پھر کہا۔
"ڈاکٹر صاحب ان کو بھی ساتھ لے جائیں۔ کافی دیر سے یہیں بیٹھے ہیں"
"ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور رات کا کیا تا بھی

روپ لیکھا کے ہاتھ کا بنا ہوا کھایا۔ مجھے حسب معمول آنے میں دیر ہو گئی۔ گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ زیدا کسی ذہنی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس وقت میں ندامت سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ آخر میں نے پوچھا۔

"تمہیں کچھ زیادہ تکلیف ہے؟"

مگر وہاں اتنی طاقت کہاں تھی۔ جو میری بات کا جواب دیتی وہ میری طرف ایک ٹک تاک رہی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی سانس نہایت مشکل سے چل رہی ہے۔ میں نے اسی وقت ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ مریضہ کو دیکھنے کے بعد وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نئی تکلیف کی وجہ کیا ہے۔ اس نے دریافت کیا۔

"کیا دوا پی ہے"؟

یہ کہہ کر اس نے کالی شیشی اٹھائی وہ خالی تھی۔ نہایت جوش کے ساتھ اس نے پوچھا۔

"کیا یہ دوا پی ہے"؟

مریضہ نے آنکھ کے اشارہ سے ہاں کہہ دی

ڈاکٹر کے جیسے حواس باختہ ہو گئے ہوں وہ بیگ اٹھا کر اپنے مکان کی طرف بھاگا۔ شاید کوئی دوسری دوا یا کچھ اوزار لانے کے لئے میرے دماغ نے چشم زدن میں تمام باتیں سمجھ لیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے دل کو پکڑ کر ہاتھ میں مسل ڈالنا چاہتا ہے۔ میں

بے دماغ ہوکر بستر پر گر پڑا۔
سچا رفیق محسن جیسے اپنے بیمار دوست کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف لرزتے ہاتھوں کے ہاتھ اٹھاکر نہایت آہستگی سے اپنے سینے کے پاس لے گئی۔ پھر میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے نرم مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔
"پیارے رنج نہ کرو۔ میں نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر کیا ہے میری زندگی کے بعد یقیناً آپ کو راحت و مسرت میسر ہوگی۔ ایشور جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے اس کی ہر بات اور ہر کام میں بھلائی ہے۔ اسی خیال کے زیر اثر میں آج نہایت تسلی اور آرام سے اس کے پاس جا رہی ہوں"۔
یہ کہہ کر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں بند کرلیں۔ اتنے میں ڈاکٹر واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ تھا۔ مگر اب سب کچھ بے سود تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو چکی تھی۔ اب اسے جگانا ناممکن تھا ڈاکٹر کی تمام تر کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ اس کے کئے مطابق اس کی تکلیف کا خاتمہ اس کی جان کے ساتھ ہوا۔
گرمی کی وجہ سے وہ ایک بار باہر برآمدے میں گئے۔ مگر چند منٹ میں پھر واپس آکر اپنی داستان شروع کی۔ جیسے اب وہ تازہ دم ہوکر غم کو ضبط کرکے آئے ہوں۔ میں یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے کہا سب بے ارادہ تھا۔ اور زیادہ طول دینا بھی غیر مناسب ہے۔ مگر

پھر بھی کسی ساحرہ کے سحر میں مسحور ہو کر جیسے کوئی سب کچھ بیان کرتا ہے۔ بالکل یہی حالت تھی۔ کوئی غیر معمولی طاقت ان کی زبان سے یہ داستان سنا رہی تھی

چند دن میں میری شادی ڈاکٹر کی لڑکی سے ہو گئی۔ مگر اب مجھے خوشی کی بجائے رنج و تکلیف ہے۔ کیونکہ جب کبھی میں نے اس سے پیار محبت کی باتیں کرنے کا خیال کیا۔ اسی وقت سنجیدگی سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسے دل میں میرے خلاف کچھ شک ہے جسے میں باوجود کافی تلاش کے بھی نہ سمجھ سکا

اب میں کچھ غمگین رہنے لگا۔ پھر چند دوستوں کی صحبت میں آہستہ آہستہ شراب پینے کی بری عادت پڑ گئی۔

خزاں آرہی تھی اور بہار جا رہی تھی۔ ایک شام کو میں اپنی نئی بیوی کے ساتھ لب دریا باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ تاریکی ہر لحظہ بڑھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ہم اس کے گھیرے میں آرہے تھے۔ تمام اطراف بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا کسی طائر کے پر بدن کی آواز تک کانوں میں نہ آتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی پتوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی جو ہوا کے اثر سے ہلتے تھے۔

وہ تھک کر ایک بنچ پر بیٹھی اور پھر سر ہتھیلیوں پر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اب مکمل تاریکی چھا گئی تھی۔ آسمان ستاروں سے نہایت خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ تھیدگردوں کی

آواز دور تک بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس وقت کچھ شراب پی ہوئی تھی۔

اس وقت نئی بیاہی بیوی کی صورت نے میرے دماغ میں ایک خاص کشش پیدا کردی۔ وہ نہایت بے فکری سے ایک خاص انداز کے ساتھ درختوں کے سائے میں لیٹی ہوئی تھی۔

وہ ایک سائے کی طرح میرے قریب تھی۔ مگر اسے اپنے بازوؤں کی گرفت لینا جیسے میری طاقت سے باہر تھا۔

یکایک ایسا معلوم ہوا کہ تمام درختوں کی چوٹیوں پر آگ لگ گئی۔ سنہرا چاند درختوں کے عقب سے اونچا ہو رہا تھا۔ پتوں سے چھن چھن کر روپ لیکھا کے منہ پر پڑ رہی تھی۔ میرے جذبات اس وقت بھڑک اُٹھے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری الفت کو کبھی نہیں بھول سکتا"۔

میرے کانوں میں جیسے کسی نے سیسہ ڈال دیا ہو۔ میرے یہی الفاظ میرے کانوں میں پہنچے تو میں چونک پڑا۔ مجھے یکدم یاد آیا کہ یہی الفاظ اس سے پہلے بھی کسی دوسری عورت کو کہے گئے تھے۔ میرے بال کھڑے ہو گئے۔ تمام جسم لرز اٹھا۔ فضا میں ایک قہقہہ کی آواز سنائی دی۔ نہ معلوم مجھے کیا ہوا میں اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ اور جب ہوش آیا تو کمرے میں چارپائی پر پڑا تھا۔

"کیا ہوا تھا؟" روپ لیکھا نے دریافت کیا۔

"تم نہیں جانتی؟ اس آواز سے تو آسمان بھی دہل گیا تھا۔ ایک خوفناک قہقہہ کی آواز تھی"

"واہ!" میری بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ تو پرندوں کا قافلہ تھا جو اڑ کر کہیں جا رہا تھا۔"

دماغ پر زور ڈالنے سے معلوم ہو گیا کہ وہ راج ہنس کا ایک جھنڈ تھا۔ جو بوجہ تبدیلی موسم دوسرے مقام پر جا رہا تھا۔ تمام دن غیر معمولی خیالات کو اپنے دماغ سے محو کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر شام ہی پھر سینکڑوں خوفناک خیالات دماغ میں گھس آئے۔ پھر ایسا معلوم ہونے لگا کہ قہقہہ کی آواز آ رہی ہے۔ اب میری پریشانی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ شام ہونے کے بعد میں اپنی بیوی سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکتا تھا۔

آخر میں نے اس مکان کو چھوڑ دیا اور کشتی پر دریا کے سفر کو روانہ ہوا۔ شب و روز سیر و تفریح خوشگوار موسم اور سرد ہوا نے میری طبیعت کو تندرست پہلی حالت میں بدل دیا۔

گنگا کو عبور کر کے دریائے پھوکری کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہماری کشتی دریا کے بہاؤ میں بہنے لگی۔ یہ ندی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سرما کی ٹھہری ہوئی نیند میں سو رہی تھی۔ ایک طرف بنجر زمین پڑی تھی۔ جہاں ریت پر سورج طلائی بارش کر رہا تھا۔ دوسری طرف لاتعداد آنکھوں کے نرگس اور ناریل کے درخت نہایت وقار سے کھڑے تھے۔

چند دن کے سفر کے بعد موزوں جگہ دیکھ کر لب دریا ہی خیمہ لگا دیا۔ ایک دن چہل قدمی کرتے ہوئے خیمہ سے بہت دور نکل گئے۔ غروب آفتاب کی سرخ روشنی روانہ ہو گئی۔ اور نیل گوں سائبان خورشید کی متواتر چاندنی سے سر دہو گیا۔ چاندنی اس لامحدود ریگستان پر چھا گئی۔

میں اس حسین منظر کی تاب نہ لا سکا۔ اور میرا دل تمنا، حسرت اور درد سے ایک بار تڑپ اٹھا۔ محسوس ہونے لگا کہ ہم دونوں اس وسیع دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ اور اس لامحدود طلسمات میں حباب کے سائے کی طرح بغیر کسی حیل و حجت کے آوارگی میں مصروف ہیں۔

اس نے اس وقت عنابی رنگ کی شال اوڑھی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے صرف اس کا چہرہ نمایاں تھا۔ ہر جانب بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دفعتاً روپ لیکھا نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ میرے جسم میں جیسے بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی پُرجوش جوانی محبت بھرا دل یہاں تک کہ اپنا بلوریں جسم سب کچھ اس سناٹے میں میرے سپرد کر دیا ہے۔ دبی ہوئی چنگاری یکایک روشن ہو گئی۔ میرے دل کی دبی ہوئی محبت اور جوش از سر نو بیدار ہو اٹھا۔ ایسا ہونے لگا۔ جیسے مجھ سا خوش نصیب اس عالم میں دوسرا نہیں دوسرا کون ہے جو اس وقت اس کھلے آسمان کے نیچے چاندنی میں آزادی اور مسرت سے ایک سا ہو جائے۔

آج میرا دل یہ چاہتا تھا۔ ہماری زندگی اس سیر و تفریح میں ختم ہو جائے
دنیا کے دھندوں سے دور۔ لوگوں کی آنکھوں سے پرے رنج و الم سے
بے بہرہ محبت کی اس پُر سحر دنیا میں کھو جائیں۔ ہم تمام تفکرات سے آزاد
اس نہ ختم ہونے والی محویت میں ایک آبشار کے کنارے پہنچے چاندنی کی تیز
شفاف کرنیں شمشیر آبدار کی طرح اس کے بلوریں پانی پر رقص کر رہی
تھیں۔ جیسے اس کے دل میں پیوست ہونا چاہتی ہیں۔
یہاں عالم مدہوشی میں کھڑے ہو گئے۔ روپ لیکھا نے خاموش
نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس دوران میں اس کی شال کچھ نیچے سرک گئی
تھی۔ اب وہ مجسمہ حسن نظر آ رہی تھی۔ میری برداشت کا پیمانہ چھلک گیا میں
نے اس کے نرم رخساروں کو بوسہ دیا بالکل اسی وقت ایک آواز فضا میں
گونج اٹھی۔
"وہ کون ہے! . . . . . وہ کون ہے؟"
جس طرح کسی پر کوئی ناگہانی مصیبت پڑی میں چونک پڑا۔ وہ مجسمہ حسن
بھی سر تا پا لرز گئی۔ مگر اس کے جلدی ہی بعد تحقیقات سے معلوم ہوا یہ
انسانی آواز نہ تھی بلکہ کوئی آبی جانور تھا جو غالباً اس سناٹے میں آواز سن
کر چونک پڑا ہو۔
منتشر حواس کو یک جا کر کے ہم جلدی واپس ہوئے شب بھی کافی گزر
چکی تھی۔ خیالات بھی پریشان تھے۔ اس لئے بستر پر لیٹتے ہی نیند نے آ دبوچا۔
یکایک ایسا محسوس ہوا کوئی میرے قریب کھڑا اپنی سفینہ کانپتی ہوئی

انگلی سے خوابِ راحت میں مدہوش روپ لیکھا کی طرف اشارہ کرکے پوچھ رہا ہے۔

"وہ کون ہے ..... وہ کون ہے؟"

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ فوراً ٹارچ کا بٹن دبایا۔ مسہری ہوا میں ہل رہی تھی، اور کشتی پانی کی لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ میرا خون سرد ہو گیا۔ پیشانی پر سرد پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس کے بعد ایک فلک بوس قہقہہ کی آواز سنائی دی۔

قہقہہ کی آواز اس سنسان تاریکی میں گونج رہی تھی۔ دریا۔ گاؤں، شہر اور ریگستان کو طے کرتی ہوئی اس طرح نمایاں ہو رہی تھی۔ جیسے یہ مستقل طور پر مسلسل کسی پوشیدہ دنیا سے آ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ آواز کم ہو گئی۔ اور پھر بالکل باریک غیر معمولی طور پر سنائی دی۔

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے یہ آواز میرے دماغ میں اپنا گھر تلاش کر رہی ہے۔ اور اب اسے نکالنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ آخر مجھے اس آواز نے دیوانہ سا بنا دیا اور وہ ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگی میں نے روشنی گل کر دی۔ اور لیٹ گیا کہ شاید نیند آ جائے۔ مگر پانچ منٹ کے بعد اس تاریکی میں پھر کوئی کہہ رہا تھا۔

"وہ کون ہے؟ ...... وہ کون ہے؟"

قصہ بیان کرتے کرتے میونسپل کمشنر صاحب کا چہرہ خوفناک اور زرد ہو گیا۔ اب ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ان کے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی

ہو۔ میں گھبرا گیا۔ اور اٹھ کر ان کے نزدیک گیا۔ پھر شانے کو ملاتے ہوئے
سوال کیا۔
"پانی لوگے؟ —— مگر کوئی جواب نہیں۔
دفعتاً چراغ ایک تیز روشنی کے بعد بجھ گیا۔ دروازے کے سوراخ
سے صبح کی ہلکی سفید روشنی داخل ہو رہی تھی۔ چھت پر ایک کوا چلاتا ہوا گزر گیا
اسی وقت چڑیا کی سیٹی کے ساتھ ایک کتے کی بھی آواز سنائی دی۔ باہر سڑک
پر ایک بیل گاڑی گزر رہی تھی جس کے پہیوں کی آواز بیل کے گھنگھروؤں
سے مل کر کچھ دلفریب ہو گئی تھی۔
کمشنر بابو کے چہرے پہ تبدیلی آچکی تھی۔ خوف کے آثار غالب تھے۔
کسی خیالی خوف کے زیر اثر انہوں نے مجھے اپنی یہ داستانِ حیات بلاارادہ
سنا دی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس ناجائز حرکت پہ خود ہی نادم
ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ خود کچھ غم و غصہ بھی چہرے پہ نمایاں ہے۔
انہوں نے اسی وقت کرسی چھوڑ دی اور بغیر رخصتی الفاظ کہے تیزی سے
باہر نکل گئے۔ میں نے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔
دوسرے دن نصف شب کو پھر وہی آواز سنائی دی۔
"ڈاکٹر! —— ڈاکٹر!!"
مگر میں خاموش اپنی چارپائی پر پڑا رہا۔

شاعر

شب منور تھی۔ روشن ستاروں میں پورن ماشی کا چاند پوری آب و تاب سے جلوہ فگن تھا۔

بھگوان وشنو سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے خود بخود کہہ رہے تھے۔

سوچا تھا کہ انسان روئے زمین کی سب سے بہتر اور حسین مخلوق ہے۔ مگر آخر یہ غلط ثابت ہوا۔ کنول پھول جو باد نسیم کے خوشگوار جھونکوں سے جھوم رہا ہے۔ تاہم چاند اور ستاروں سے بہت زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دلکش گلابی پنکھڑیاں اس نور چاندنی میں اپنا جوبن سنبھال نہیں سکتیں۔ ان کی خوبصورتی رعنائی اور دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ میں خود اپنی نگاہوں کو اس سے ہٹانا نہیں چاہتا۔ کیا انسان میں

اس کے بدلے کوئی چیز ہے یا نہیں؟"
اس کے بعد ایک سرد آہ کھینچی اور کچھ دیر خاموش رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا تخیل انسانی دنیا میں پرواز کر رہا ہے۔ پھر ہونٹ تھرانے لگے آواز پیدا ہوئی وہ کہہ رہے تھے۔

"مگر ایسا ہونا کیوں ضروری ہے! مجھے اپنی قوت سے ایک نئی چیز پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔؟ اس لئے کہ وہ انسان کی خوشی اور راحت کا موجب بنے۔ تمام جاندار چیزوں میں کنول کی طرح خوبصورتی ہو۔ سرزمین و آسمان سب کی راحت سب کی تمنا۔

چند سیکنڈ پھر خاموشی رہی۔

"کنول" تو ایک دوشیزہ کی شکل میں جا۔"

پانی میں ہلچل (کھلبلی) پیدا ہوئی۔ جیسے کوئی پرندہ نہا رہا ہو۔ ایک لمحہ کے لئے جن بادلوں نے چاند کو چھپا لیا تھا۔ وہ منتشر ہوگئے۔ چاندنی اور بھی بکھر گئی۔ اب ہر جانب بالکل خاموشی کا عالم سناٹا تھا۔ ایک بار پانی میں پھر مدوجزر پیدا ہوا۔ کنول ایک عجیب دلکش انسانی شکل میں کھڑا تھا وہ کمال حسین عورت تھی۔ دیوتاؤں نے دیکھا تو محو حیرت ہوگئے ایسی پُرفریب شکل کسی نے پیشتر نہ دیکھی تھی۔ حسینہ کو مخاطب کرتے ہوئے بھگوان نے کہا۔

"پہلے تو کنول پھول تھی۔ اور اب میرے خیالات کا پھول ہو۔ کچھ کہو" دوشیزہ کے یاقوتی ہونٹ پھر پھڑائے پھر کچھ آواز پیدا ہوئی ٹھیک

ویسی جیسے کنول کی پنکھڑیاں ہوا میں بج رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ آواز بالکل انسانی بن گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

بھگوان! آپ نے مجھ پر بڑا اکرم کیا ہے۔ مجھے جاندار ہستی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب مجھے کہاں رہنے کا حکم ہے؟ کیونکہ میری فطرت میں ہمیشہ خوف قائم رہا ہے۔ جب میں کنول تھی تو ہوا کے تند جھونکوں سے گھبرا جاتی تھی۔ اور اسی وقت اپنی آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ برق اور آندھی سے دہشت زدہ ہو جاتی تھی بادل کی گرج سے دل گھبراتا تھا۔ اس لئے اپنی فطرت کے مطابق اب بھی زمین سے گھبراتی ہوں۔ مجھے کسی موزوں جگہ رہنے کا حکم دیجئے۔"

بھگوان نے چند سیکنڈ آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہیں آخر بولے۔

"کیا پہاڑ کی چوٹی پر رہنا پسند کرو گی؟"

"بالکل نہیں"

"کیوں؟"

"وہاں برف کی خون جما دینے والی ٹھنڈک ہے۔ میں سردی سے بہت دور رہنا چاہتی ہوں"

"اچھا میں نے سمندر کی تہہ میں ایک بلوری محل تعمیر کروایا ہے۔ کیا وہاں رہو گی۔؟"

"مہاراج! میرا وہی جواب ہے"

"وجہ؟"

"سمندر کی تہہ نہایت خوفناک اور خطرناک جانوروں کا مسکن ہے۔

اس لئے میں گھبراتی ہوں"۔

"مگر تم تو بلوری محل میں رہوگی"۔

"آپ یہ جانتے ہیں کہ شیشہ سے ہر چیز صاف طور پہ نظر آتی ہے کیا

وہ جانور مجھ سے پوشیدہ رہیں گے"؟

ہاں خوب یاد آیا۔ میرا خیال ہے تمہیں سنسان بیابان میں جہاں

انسان، حیوان، چرند، پرند کوئی دکھائی نہ دیتا ہو۔ جہاں تمہیں کسی چیز کا

خوف نہ ہو وہاں رکھا جائے۔

"میں آپ کو کیا جواب دوں، آپ دانا ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ مگر پھر بھی بالکل

نادان بننا چاہتے ہیں"۔

"وجہ؟"

کیا آپ نہیں سوچتے کہ وہاں کی خوفناک طوفانی آندھی کو بجلی کی پُرزور

کڑک کو، بارش کی خوفناک صدا کو، اور پھر موت ایسی خاموشی کو میں

کیسے برداشت کر سکوں گی؟ میرا یہ ننھا سا دل کانپ جائے گا"؟

"تو پھر تمہارے لئے کون سی جگہ تجویز کی جائے؟"

"مجھ سے بہتر آپ جانتے ہیں۔ تینوں لوک کی خبر آپ کو ہے۔ میں

تو آپ کے سامنے بالکل انجان ہوں"۔

خیر یہی سہی تمہارے لئے ہمالیہ کی ایک تاریک غار بہت اچھی رہے گی۔ میرے خیال میں وہاں تمہیں کسی قسم کا خدشہ نہیں خوف نہیں بالکل تنہائی اور ڈر سے دور ہے۔

یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہاں میرے لئے خوف نہیں؟ اس مسلسل خوفناک اندھیرے کو میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔ شاید وہاں دم گھٹ کر چیخ مار کر جان دے دینا پڑے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ میرا نازک دل اس قدر ہیبت ناک تاریکی کو برداشت کرے گا۔"

بھگوان اس عجیب وغریب سوالات وجوابات سے گھبرا کر ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اور منہ میں انگلی ڈال کر کسی گہری سوچ میں نظر آنے لگے۔ اس وقت تینوں لوک ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ وہی دوشیزہ سر جھکائے سہمی ہوئی زمین کی طرف نگاہ کئے بازو لٹکائے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام چیزیں فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے گزر رہی تھی جنگل، پہاڑ۔ دریا، آسمان سمندر آبادی ویرانہ، باغ جنت، دوزخ، غرضکہ سب کچھ انہوں نے دیکھا۔

کئی گھنٹے گزر گئے صبح کی سفیدی نمودار ہوئی۔ مشرق کی طرف سے سنہری کرنیں اونچی ہونے لگیں۔ تالاب کا نیلا پانی جنگل کے سبز درخت بانس کے لمبے لمبے پتے تمام سنہری روشنی سے منور ہو گئے۔ بگلے ہنس سارس پانی میں کھیلنے لگے۔ مور اور کوئل جنگل میں شور مچانے لگے ہر طرف

سورج کی آمد کی خبر ہو گئی۔

اسی وقت ساز کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک شیریں نغمہ شروع ہو گیا۔ وشنو ابھی تک محو تخیل تھے۔ یکایک چونک پڑے اور بولے۔

"شاعر سورج کو پرنام کرنے آیا ہے۔"

چندے انتظار کے بعد شاعر نمودار ہوا۔ ایک عجیب سی انسانی شکل دیکھ کر اس کا ساز بجنا بند ہو گیا۔ ستار زمین پر گر پڑی۔ دونوں ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ وہ کھڑا محو حیرت دیکھتا رہا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اور اب یہ سحر تا زیست قائم رہے گا۔ ایک پتھر کے بت کی طرح بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ بھگوان نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"کیوں خاموش کیوں ہو؟"

"میں نے آج محبت کی پر سحر زمین میں قدم رکھا ہے۔"

اس کے بعد شاعر کا گلہ رک گیا۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔ بھگوان کا چہرہ بجلی کی طرح چمکا۔

یکایک ان کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے کہا۔

"حسینہ تمہارے لئے مناسب جگہ کی تلاش تھی وہ مل گئی ہے۔"

"مگر مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

شاعر کا دل"
"جیسے آپ کی خوشی"
بھگوان نے شاعر کے دل کو آئینہ کی طرح شفاف کر دیا۔ دوشیزہ اپنی گمین گاہ میں داخل ہونے لگی۔ مگر جیسے ہی اس نے شاعر کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا۔ اس کا چہرہ کانچ کی طرح سفید ہو گیا۔ دل پہ ایک خوف طاری ہوا آنکھیں پتھرا گئیں ہونٹ کانپ اٹھے۔ بھگوان نے دیکھا تو سوال کیا۔

"کیوں یہاں بھی رہنا پسند نہیں؟ کس بات سے ڈرتی ہو؟"
"بھگوان آپ نے میرے لئے نہایت خطرناک، عجیب و غریب اور دل ہلا دینے والی تجویز کی ہے۔"
"کیسے؟"

مہاراج! وہاں تو برف کی فلک بوس چوٹیاں۔ پانی کی پر اسرار گہرائیاں بیابانوں کی خوفناک طوفانی ہوائیں۔ بجلی کی کڑک بادل کی گرج اور خوفناک غاروں کا اندھیرا سب کچھ موجود ہے۔ میں یہاں کیسے رہ سکوں گی! جس کو ایک چیز کا خوف ہو وہ ان بے شمار خوف پیدا کرنے والی چیزوں کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے۔"
بھگوان ہنس دیئے۔ پھر کچھ سوچ کر جواب دیا۔
"گھبراؤ مت وہاں برف ہو گی تو تم اسے ہوا کے گرم جھونکوں سے تبدیل کر دو گی۔ پانی کی گہرائیوں میں موتی بن جاؤ گی۔ بیابانوں میں خوشی اور مسرت

بن کر چھپاؤ گی۔ تاریکی میں خورشید کی ٹھنڈی چاندنی پیدا کر دو گی۔"
اس وقت شاعر کے حواس قائم ہو چکے تھے۔ اس کی طاقتِ گویائی واپس آگئی تھی۔ بھگوان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ——— "یہ چیز تمہیں دیتا ہوں تمہاری کائنات میں اضافہ کرنے کے لئے اسے لے جاؤ اور مسرت کی زندگی بسر کرو۔"

ادائیگی قرض

بدقسمتی سے کملا پرشاد کو ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ وہ کسی غریب آدمی کا لڑکا نہ تھا۔ اس کا والد اتنی جائداد چھوڑ گیا تھا کہ اگر وہ ملازمت نہ کرتا تب بھی خوشی سے اوقات بسری کر سکتا۔ لیکن والد کے انتقال کے بعد ہی تمام جائداد اس کے بڑے بھائی بہاری لعل کے قبضہ میں آگئی۔ اس وقت کملا پرشاد صغیر سن تھا۔ بہاری لعل نے جائداد پاتے ہی اسے تھوڑے ہی عرصے میں تلف کر دیا۔ اس کے بُرے چال چلن اور بد صحبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ گھر کی ساری جائیداد بک گئی اور آخر میں رہنے کا مکان بھی اس نے گروی رکھ دیا۔ اس پر بھی اُسے ہوش نہ آیا۔ اپنی مراد اور شوق پورا کرنے کے لیے وہ چوری کرنے

لگا۔ اور ایک مرتبہ گرفتار ہو کر اسے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ جیل سے رہا ہوتے ہی نہ معلوم وہ کہاں چلا گیا۔ کسی کو اس کا پتہ نہ لگا۔
گاؤں کے سب آدمی اس سے بے فکر ہو گئے۔ اُن کے سر سے گویا ایک بلا ٹل گئی۔ لیکن اس کی والدہ کو اس کے جانے سے جو سخت رنج ہوا اُسے وہی جانتی تھی۔ وہ رات دن بہاری کے لئے رونے لگی۔
اس وقت گھر کا سارا بوجھ کملا پرشاد پر آپڑا۔ کملا پرشاد ابھی لڑکا تھا وہ گھر کے کاروبار سے بالکل ناواقف تھا۔ دونوں وقت دو لقمے کھانے درکنار اُسے اپنا سر رکھنے تک کو بھی کہیں جگہ نہیں تھی۔ اس لئے اُسے ملازمت کے لئے کوشش کرنی پڑی۔ بڑی مشکل سے اُسے ایک دور گاؤں میں ملازمت ملی۔ وہ اپنی والدہ اور بہن کو چھوڑ کر اپنی نوکری پر چلا گیا۔ جاتے وقت اس کی والدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "بیٹا بڑے بھائی کا خیال بھی رکھنا۔ ہائے میرا پیارا بیٹا کہاں گیا۔ ایسے کہتے کہتے وہ زار زار رونے لگی۔ کملا پرشاد نے والدہ کو تسلی دے کر کہا۔ اے ماں فکر نہ کرو۔ میں بھائی کا پتہ ضرور لگاؤں گا۔ اور اُسے بہت جلدی تمہارے سامنے لا کر ضرور حاضر کر دوں گا۔
کملا پرشاد اپنی والدہ سے یہ بات کہہ تو آیا لیکن بھائی کا پتہ لگانا اس کے لئے بالکل ناممکن تھا۔ وہ تمام دن کام کاج میں مصروف رہتا تھا۔ پھر تلاش کرے تو کب۔ وہ رہ کر بیچ بیچ میں اس کا دل اپنی والدہ کے رنج سے گھبرا اُٹھتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرے لاچار تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر کوئی دن

ایسا آوے کہ دوسرے کی نوکری نہ کرنی پڑے تو ضرور بھائی کو تلاش کر کے اپنی والدہ کا رنج رفع کر سکوں گا۔ ورنہ اس جنم میں تو کچھ اُمید نہیں ہے۔

کملا پرشاد کا مالک اس کو دل سے چاہتا تھا۔ ایک بڑے خاندان کا لڑکا مصیبت زدہ نوکری کے لئے آیا ہے۔ ایسا خیال کر کے اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ اور وہ ہر طرح سے کملا پرشاد کی بھلائی کے لئے کوشش کیا کرتا تھا۔ موقعہ بہ موقعہ کملا پرشاد جب دوسرا کام کرتا تھا۔ اس کے عوض وہ اُسے علیحدہ اُجرت دیتا تھا۔ اس کے علاوہ مالک کے ہاں جو تہوار وغیرہ ہوتے تھے۔ ان میں بھی اور ملازموں کی نسبت کملا پرشاد کو زیادہ انعام مل جاتا تھا اس طرح کچھ دیگر آمدنی ہو جانے کے باعث وہ اپنی والدہ اور بہن کے کھانے پینے کا خرچ نکال کر بھی تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع کرنے لگا۔

کملا پرشاد نے حساب لگا کر دیکھا کہ ہزار روپیہ میں اس کی رہن کی ہوئی زمین اور مکان فک الرہن ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہونے پر پھر اُسے ملازمت کی ضرورت نہ رہے گی۔ اپنی زمین کی فصل کی آمدنی سے ہی اس کی بسر اوقات بخوبی ہونے لگے گی۔ اور اُس وقت بے فکر ہو کر وہ اپنے بھائی کا پتہ بھی لگا سکے گا۔ بس اگر اس نے اپنی زمین۔ گھر اور بھائی کو حاصل کر لیا۔ تو پھر اور کیا چاہیئے۔ اس کی ساری خواہشات پوری ہو جائیں گی۔

یہ ہزار روپے کیسے اور کس قدر عرصے میں جمع ہوں گے۔ رات

دن وہ یہی سوچتا رہتا تھا۔ آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے تھوڑا تھوڑا کرکے ہی بہت عرصہ تک جمع کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس کو ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیتا۔ وہ کہتا کہ کہیں قطرہ قطرہ پانی سے سمندر بھر سکتا ہے۔ لیکن کملا پرشاد تحمل سے اس ناممکن بات کو بھی ممکن بنانے کے لئے آمادہ تھا۔ اس کے بغیر اس کا چھٹکارا نہ ہوا۔

بہت عرصہ تک انتظار دیکھتے دیکھتے آخر کار وہ مبارک دن آگیا اس ماہ کی تنخواہ ملتے ہی اس کے ہزار روپیے پورے ہو جائیں گے رفتہ رفتہ وہ مہینہ بھی ختم ہو گیا۔ آج کملا پرشاد کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اب اس کی زندگی کی ساری خواہش سپھل ہوا چاہتی تھی۔

کملا پرشاد کے جمع شدہ روپیے اس کے مالک کے پاس رہتے تھے جس دن ایک ہزار روپے پورے ہو گئے۔ اسی دن وہ اپنے مالک کے پاس رخصت ہونے کے لئے گیا۔ وہ اس کی ساری باتیں سنکر خوش ہوا۔ کملا پرشاد کی ملازمت کا عرصہ ختم ہو گیا۔ یہ جان کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

کملا پرشاد اب زیادہ دیر نہیں کر سکتا۔ اس قدر عرصہ تک دھیرج رکھ کر بھی اب اس کا دل ذرا بھی دھیرج نہیں رکھ سکتا۔ اسی وقت وہ روپیے لے کر اپنے گاؤں کو واپس جانا چاہتا ہے۔ اس کے مالک نے کہا اچھا تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ لیکن اس قدر روپیے اکیلے ہمراہ نہ لے جاؤ۔ کیونکہ راستہ اچھا نہیں ہے۔ چور ڈاکو ؤں کا ڈر ہے۔

اس وقت کچھ روپے ساتھ لے جاؤ۔ اور پھر اسی طرح تھوڑے تھوڑے کر کے سارے روپے لے جانا۔

کملا پرشاد اب ٹھیر نہیں سکتا۔ اس وقت تک کیا وہ تھوڑا ٹھیرا ہے؟ اور اب پھر بھی ٹھیرنا؟ اب بھی دیر۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا معاف کیجیے کچھ ڈر نہیں میں بہت ہوشیاری کے ساتھ روپے لے جاؤں گا۔ مالک نے ایک مرتبہ پھر بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ کملا پرشاد نے اپنے مالک کی بات پہلے کبھی نہیں ٹالی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں میرے ہی فائدے کے لئے کہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ آج اپنے دل کی بے قراری کو زیر نہ کر سکا۔

مالک نے اس کے سارے روپے لا کر اس کے سپرد کر دیئے۔ روپوں کو ہاتھ میں لیتے ہی ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا وہ اس کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ وہ سب کے سب اس کے دل میں بسے ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی وہ انہیں پہچان سکتا ہے۔ کتنا روپیہ کس جگہ دیا ہے۔ کون کس جگہ سے گھسا ہوا ہے۔ کون چمکتا ہے اور کون میلا ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کون سے روپے اسے اپنے مالک کی دختر کی شادی کے وقت انعام میں ملے تھے اور کون سے لڑکے کی پیدائش کے وقت۔ بہت عرصہ بعد پیارے رشتہ داروں کے ملنے سے جیسی خوشی ہوتی ہے روپوں کو دیکھ کر کملا پرشاد کو آج ویسی ہی خوشی ہونے لگی۔

ان روپوں کو خوب ہوشیاری سے باندھ کر اس نے اسی رات اپنے

گھر کی راہ لی۔ سویرے تک ٹھہرنا اس کے لئے دوبھر ہو گیا۔ جاتے وقت اس کے مالک نے کہا تم اپنے ہمراہ ایک ہتھیار لیتے جاؤ۔ معلوم کب کونسی آفت آجائے۔ ایسا کہہ کر اس نے ایک عمدہ تلوار نکال کر اس کی کمر سے باندھ دی۔

کملا پرشاد گھر سے باہر ہوا۔ گاؤں کے درمیان سے جاتے جاتے اس کے تمام معلومہ مقامات مثلاً شہر کی عمارات۔ گھاٹ راستہ وغیرہ اس سے یکے بعد دیگرے جدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور گویا وہ سب ہی سے دل ہی دل میں کہتا جاتا تھا۔ اچھا بھائی! اب میں جاتا ہوں۔ اب میں جاتا ہوں۔

کملا پرشاد جا رہا ہے۔ اس وقت وہ خوش نہیں ہے۔ اسے بار بار رونا آتا ہے۔ رہ رہ کر ایک تکلیف اس کے دل کو پریشان کر رہی ہے کہ میں گھر جا کر اپنی والدہ سے کیا کہوں گا۔ وہ کچھ روپے کی انتظار میں تو نہیں بیٹھی ہو گی۔ میں آتے وقت بھائی کو تلاش کر کے گھر لانے کی تسلی دے آیا تھا۔ والدہ اسی بھروسے پر انتظار کر رہی ہو گی۔ کچھ دور چل کر اس نے اپنے دل میں خیال کیا۔ خیر جہاں اس قدر عرصہ اس نے انتظار کی ہے۔ دو دن اور سہی۔ دیس میں پہنچتے ہی بھائی کو تلاش کرنے کی ضرور ہی کوشش کروں گا۔

گاؤں پیچھے رہ گیا۔ آگے بڑا خوفناک جنگل ہے جنگل کے بیچوں بیچ ایک راستہ ہے۔ وہ اس راستہ سے جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے رات

زیادہ ہوگئی۔ اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔ کہیں بھی روشنی کا نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ درخت گویا نیچے سے اوپر تک تاریکی کے گڑھے میں ڈوب گئے ہیں۔ اپنا جسم بھی آپ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن کملا پرشاد کے دل میں اس قدر جلدی ہے کہ کوئی بھی تکلیف اس کے حوصلے کو نہیں گرا سکتی۔ وہ اس تاریکی سے گزرتا ہوا برابر چلا جا رہا ہے۔

اُس گہرے اندھیرے میں چلتے چلتے وہ کسی وقت راستہ بھول گیا اس کی اُسے کچھ بھی خبر نہ تھی۔ آخر میں جب درخت کی ڈالیوں نے اس کے جسم میں لگ کر اس کی رفتار کو روک دیا۔ تب وہ بھوچکا سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور راستہ کی تلاش کے لئے چاروں طرف بھٹکنے لگا۔ لیکن راستہ نہ ملا۔ وہ تلاش کرتے کرتے تھک گیا اور اِدھر اُدھر پھرتے رہنے سے رفتہ رفتہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ میں کس طرف سے آیا تھا۔ اور کہاں جاؤں گا کبھی کوئی ایک راستہ دکھائی پڑتا ہے اور اس پر چلتا ہے کہ پھر جنگل میں جا پہنچتا ہے۔ اس طرح بھٹکتے بھٹکتے اُسے اچانک کسی آدمی کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ گویا اس تاریکی کو چیرتا ہوا کوئی اس کی جانب چلا آرہا ہے۔ پاس آتے ہی کملا پرشاد نے دیکھا کہ ایک جنگلی شکاری ہے۔

اسے دیکھ کر کملا پرشاد کی جان میں جان آگئی۔ اس نے جلدی سے پوچھا بھائی! کیا تم مجھے راستہ بتا سکتے ہو؟

شکاری نے اسے نیچے سے اوپر تک تیز نگاہ سے دیکھ کر پوچھا تمہیں کہاں جانا ہے؟

کملا پرشاد نے اپنے گاؤں کا نام بتا دیا۔
شکاری اس کو تھوڑی دور ساتھ لیئے ہوئے ایک راستہ پر آ پہنچا۔ اور پھر بولا۔ اسی سامنے کے راستے سے برابر شمال کی طرف چلے جاؤ۔
کملا پرشاد اسی راستہ سے چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ تکان کے باعث اس کا جسم ڈھیلا ہونے لگا۔ پاؤں نے جواب دے دیا۔ اسی اتنے میں اسے تھوڑی دور پر ایک پھوس کا گھر نظر آیا۔ اس میں سے ایک دھیمی روشنی کی لائن باہر کی سخت تاریکی پر پڑ رہی ہے۔ کملا پرشاد اسی جھونپڑی کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ دیکھا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی کپڑے سی رہی ہے۔ اتنی رات ہونے پر بھی نیند کا اسے بالکل خیال نہیں۔ وہ دل وجان سے کام کر رہی ہے۔ کملا پرشاد نے اس سے کہا۔ میں تھکا ہوا مسافر ہوں۔ آج رات کے لیئے کیا مجھے یہاں جگہ مل سکتی ہے؟
عورت کچھ دیر تک اس کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر بڑے تعجب سے بولی۔ اتنی رات گیئے تم اس راستہ سے کیسے آئے؟
کملا پرشاد۔ میں جنگل میں راستہ بھول گیا تھا قسمت سے ایک شکاری نے مجھے یہ راستہ بتا دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا اور کھڑا نہ رہ سکا۔
کچھ دیر تک وہ عورت خاموش نہ معلوم کیا سوچتی رہی۔ کچھ ادھر اُدھر

کرنے لگی۔ اور آخر میں وہ اِدھر اُدھر چاروں طرف دیکھ کر زبان سے بولی۔ معلوم ہے تم کہاں آ گئے ہو؟

کملا پرشاد۔ (عورت کے چہرے کی طرف دیکھ کر) نہیں تو۔ یہ کونسی جگہ ہے؟

عورت۔ یہ ڈاکو کا گھر ہے۔ جس شکاری نے تمہیں راستہ بتایا ہے وہ ڈاکو ہے۔ اور یہ اُسی کا گھر ہے

کملا پرشاد۔ (گھبرا کر) تو اب میں کیا علاج کروں؟

عورت۔ علاج تو کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوگا۔

اس نے یہ کہا ہی تھا کہ باہر سے کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی عورت نے گھبراہٹ کے ساتھ مسافر سے کہا۔ اُٹھو۔ اُٹھو دیر نہ کرو۔ اور اسے جلدی ہی ایک اندھیری جگہ میں چھپا دیا۔

شکاری نے گھر میں قدم رکھتے ہی عورت سے دریافت کیا۔ شکار کہاں ہے؟

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صرف حیرت کی نگاہ سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ شکاری نے گرج کر کہا۔ شکار کہاں گیا۔

عورت: جیسے کچھ بھی نہ معلوم ہو۔ ایسی حالت ظاہر کرتے بولی۔ شکار!

شکاری۔ ہاں ہاں۔ شکار۔

عورت۔ تعجب سے۔ کونسا شکار؟

شکاری۔ بےقرار ہو کر۔ میں نے برابر اُسے اسی راستے آتے دیکھا ہے راستہ میں بھی نہیں گھر میں نہیں۔ تو کیا وہ اُڑ گیا؟

عورت۔ کیا معلوم؟

شکاری غصہ سے دیوانہ ہو کر بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیری ہی کرامات ہے۔ ابھی تک تیری یہ بیماری دور نہیں ہوئی۔ بول کہاں چھپا دیا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے زور سے ایک لات ماری۔ عورت زمین پر گر پڑی۔ تب بھی اس نے کچھ نہ کہا۔

عورت کو خاموش دیکھ کر اس کا غصہ بڑھنے لگا۔ پیٹتے پیٹتے اس نے اسے ادھ موئی کر ڈالی۔ تب بھی اس نے زبان سے اُف تک نہ کی۔ پڑی ہوئی مار کھاتی رہی۔

اب کملا پرشاد سے نہ رہا گیا۔ اس نے سوچا کہ اب چھپے رہنے سے کام نہیں چلتا۔ میرے لئے بے چاری ناحق ستائی جا رہی ہے۔ وہ فوراً باہر آ کر بولا۔ اس بے چاری کو ناحق کیوں مارتے ہو۔ لو میں حاضر ہوں۔

اب عورت کو چھوڑ کر وہ شیر کی طرح کملا پرشاد پر ٹوٹ پڑا۔ کملا پرشاد اس وقت بھی اس قدر تھکا ہوا تھا کہ وہ اچھی طرح کھڑا بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ ڈاکو نے اس کا سارا روپیہ

آسانی سے چھین لیا۔ اور اسے ایک پھٹا پرانا کپڑا پہنا کر باہر نکال دیا۔ کملا پرشاد نے ذرا بھی چوں وچرا نہیں کی۔ اس لئے ڈاکو کو اسے جان سے مار ڈالنے کی کوئی ضرورت ظاہر نہ ہوئی۔

کملا پرشاد بے مدد اور بے سرمایہ ہو کر راستہ میں کھڑا تھا ڈاکو نے اس کی تلوار تک چھین لی ہے۔ راستہ میں جنگلی جانوروں کا خوف تھا۔ اس لئے کملا پرشاد نے گھبرا کر کہا۔ میرا تم سب کچھ لے چکے ہو لیکن میری تلوار تو مت لو۔ ورنہ اس خوفناک جنگل میں جنگلی جانور مجھے مار ڈالیں گے۔

ڈاکو کو کچھ رحم آ گیا۔ تلوار لے کر وہ کملا پرشاد کو دینے لگا۔ اندھیرے میں تلوار چمکنے لگی۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا۔ اوہ! یہ تو بالکل نئی نظر آتی ہے۔ اچھا ٹھیرو میں تمہیں ایک دوسری تلوار لا دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے گھر میں سے ایک پرانی تلوار لا کر کملا پرشاد کو دے دی۔

دوسرے دن سویرے کملا پرشاد غمگین اور شرمسار ہو کر اپنے مالک کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہوا۔ شرم کے باعث مکان کے اندر نہ جاتا تھا۔ بہت عرصہ تک سخت محنت سے حاصل کئے ہوئے روپوں کے ضائع ہو جانے سے اگر اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن مالک کا حکم نہ ماننے سے میری یہ بُری حالت ہوئی ہے۔ یہ بات اس کے دل میں اس سے بھی زیادہ تکلیف دے رہی تھی۔ اپنا منہ دکھانے میں اسے بہت شرم معلوم ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مالک مکان کے باہر آیا۔ اس نے دیکھا

کہ غمگین اور جھکا سر کئے ہوئے کملا پرشاد کھڑا ہے۔ اسے بڑی حیرت ہوئی
اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہیں کسی جادوگر کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ یہ
کیا وہی کملا پرشاد ہے جو کل رات کو رخصت ہو کر گھر گیا تھا؟ کملا پرشاد
کی حالت دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ جلدی سے ہاتھ پکڑ کر اسے گھر
کے اندر لے گیا۔ کملا پرشاد نے رات کی تمام سرگزشت کہہ سنائی
مالک نے اسے چپ چاپ سن لیا۔ اس کی ذرا بھی بے قدری نہیں
کی۔ کملا پرشاد جس طرح گزشتہ رات کو کام کرتے کرتے چلا گیا تھا۔
آج سویرے وہی کام پھر کرنے لگا۔ درمیانی رات کی کارروائی گویا
اس کے لئے مثل خواب ہو گئی۔

ڈاکو نے جو پرانی تلوار دی تھی۔ اسے کملا پرشاد نے اپنی خوابگاہ
کے کمرے کی ایک دیوار پر لٹکا دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس رات کی تمام
سرگزشت اس کی آنکھوں کے سامنے ظاہراً شکل میں پھر جاتی تھی۔ دن
بھر کام کرنے کے بعد رات کو جب وہ گھر آتا تھا تب روپیوں کا رنج
از سر نو تازہ ہو کر اسے تکلیف دینے لگتا تھا۔ اور کم ہمتی اس کے دل کو
بالکل توڑ دیتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کیا اب رہن شدہ زمین فک الرہن
ہو سکتی ہے اور کیا اب بھائی کو تلاش کر سکیں میں والدہ کے رنج کو رفع
کر سکوں گا۔ اس کی ساری امیدیں، سارے تصورات خاک میں مل
گئے۔ اس رات کی سرگزشت کو بھولنے کی اگرچہ وہ بہت کوشش کرتا
تھا لیکن وہ تلوار اس بات کی [illegible] جس وقت

اس ڈاکو کے گھر کی عورت کا قصہ اُسے یاد آتا تھا۔ اُس وقت اُس کا دل شکر گزاری سے بھر جاتا تھا۔ میری حفاظت کرنے کے لئے اس نے کس قدر تکلیف سہی۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا تھا۔ کہ اس کے قرضہ کو کیا اب میں اس جنم میں کبھی ادا کر سکوں گا؟

آخر میں اُسے اِس تلوار کا اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا ناقابل برداشت ہو گیا۔ پہلے وہ نہیں خیال کر سکا کہ میں اس سے کیا کام لوں لیکن بعد میں اس نے اُسے پُرانی چیزوں کی دُکان پر فروخت کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ گاؤں میں تھوڑی دور پرانی اشیا کی دوکان تھی۔ ایک دن وہ اس تلوار کو لے کر وہاں گیا۔ دوکاندار بوڑھا تھا۔ اس کی بینائی میں فرق آ گیا تھا۔ وہ اس تلوار کو آنکھوں کے بالکل قریب لے جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے جب اس کی نظر ایک مقام پر پڑی۔ تب وہ چونک پڑا اور بولا۔ یہ چیز تو بہت قیمتی ہے۔

کملا پرشاد خاموش ہو رہا۔ دوکاندار نے پھر کہا۔ اس پر بادشاہ کی مُہر ہے یہ قیمتی تلوار ہے

کملا پرشاد نے پوچھا کس قیمت کی ہے؟

ڈیڑھ ہزار کی۔

ڈیڑھ ہزار! کملا پرشاد چونک پڑا۔ اگر ایسا ہے تو اس سے تو سارے دُکھ دور ہو سکتے ہیں۔

ڈیڑھ ہزار روپیہ سے کر کملا پرشاد کے دل میں مختلف طرح کے

خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ دل ہی دل میں سوچا کرتا تھا کہ وقت آنے پر ڈاکو کی عورت کا قرضہ ادا کر دوں گا۔ اُس وقت وہ کہنے لگا کہ یہی تو وقت ہے مجھے تو ایک ہزار روپے سے غرض ہے۔ باقی پانچ سو روپے ہیں۔ تو آسانی سے اس قرضہ سے سبکدوش ہو سکتا ہوں اور پانسو روپیوں کو پاکر وہ بھی اس ڈاکو کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے رہا ہو سکتی ہے۔ وہ ضرور ہی اس کی زرخرید غلام ہے۔ ان باتوں کو وہ جس قدر سوچنے لگا۔ اس کے قرضہ کی ادائیگی کی خواہش اس قدر زبردست ہوتی گئی۔ یہ بات بار بار اس کے دل میں آنے لگی کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا یعنی اس قرضہ کو ادا نہ کروں گا۔ تو میرے پاپ کی انتہا نہ ہوگی۔

مالک کے پاس ایک ہزار روپیہ رکھ کر وہ پھر چل دیا۔ اس نے اپنے پاس صرف پانسو روپے رکھے۔ اس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ یہ روپیہ اس عورت کو دے کر گھر کا راستہ لوں گا۔ اور راستہ میں جو گاؤں ملیں گے ان میں بھائی کی تلاش بھی کرتا جاؤں گا۔ اُسے یقین تھا کہ بھائی ہمیں کسی گاؤں میں خفیہ طور سے رہتے ہیں۔ اور شرم کے باعث اپنے گاؤں کو واپس نہیں جا سکتے۔ کملا پرشاد وہ سمجھتا ہے کہ میرے بُرے دن بیت گئے۔ اور اچھے دن آرہے ہیں۔ صرف ایک تکلیف ہے اگر بھائی کو ساتھ نہ لے جا کر میں اپنی والدہ کے پاس پہنچا تو ان سے کیا کہوں گا۔

اس مرتبہ وہ ایسے وقت روانہ ہوا تھا کہ جس سے سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اس جنگل سے پار ہو جائے لیکن جس وقت وہ ڈاکو کے

گھر پہنچا۔ اس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ گھن دار درختوں کے درمیان سے اس کی سنہری شعاعیں آ رہی تھیں۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس جا رہے تھے۔ سارا جنگل سورج کی دھیمی روشنی اور پرندوں کی شیریں آواز سے خوشنما معلوم ہوتا تھا۔

کملا پرشاد اُس ڈاکو کے گھر پہنچا۔ وہ اُس کی عورت کو پوشیدہ طور پر روپیہ دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر ڈاکو کو معلوم ہو جائے گا۔ تو وہ ضرور اس سے روپیہ چھین لے گا۔ ایسا خیال کر کے وہ بلا کچھ کہے سُنے ایک طرف کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ دن کی روشنی اب رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ اور سائے کی مانند اندھیرا رفتہ رفتہ اس گھر پر چھانے لگا۔ پرندوں کا شور و غل جاتا رہا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ اسی اثنا میں اس گھر کے اندر ایک چراغ کی روشنی نظر آئی۔ زیادہ دیر کرنے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہ جلدی اس گھر کے اندر چلا گیا دیکھا کہ ایک میلی سی چارپائی پہ ڈاکو چپ چاپ پڑا ہے۔ اور اس کی عورت اس کے سرہانے چراغ جلائے بیٹھی ہے۔ اُسے دیکھتے ہی وہ حیران ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کملا پرشاد نے جھٹ پٹ اس کے پاس روپوں کی تھیلی رکھ کر کہا۔ یہ لو اس رات کو تم نے میرے لئے جو کچھ کیا تھا۔ اس کا عوض میں اور کسی طرح نہیں دے سکتا۔

روپیوں کو دیکھتے ہی عورت کے چہرے پہ جو رنج کا سایہ تھا۔ وہ گویا یکایک دور ہو گیا۔ وہ آبدیدہ ہو کر بولی۔ آج تم نے ہم لوگوں کو جان بخشی ہے۔ ہم لوگ بھوک سے مر رہے تھے۔

روپیوں کا نام سُنکر ڈاکو بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کملا پرشاد جانے لگا تو
ڈاکو نے اُسے اشارے سے بُلایا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے پاس
جاکر کھڑا ہو گیا۔
ڈاکو کا دل شکر گذاری سے بھر آیا۔ وہ ایک تو مرضوں میں مبتلا تھا
اور اس پر بھی بھوک کے باعث مر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے سامنے
موت کا سایہ دیکھ رہا تھا۔ اس تنہا جنگل میں اُسے کہیں بھی کوئی اُمید کی علامت
نظر نہیں آتی تھی۔ پر یہ کیا تھا۔ ایک دن وہ جس کو جان سے مار ڈالنے کے
لئے گیا تھا۔ وہی آج اسے زندگی دینے آیا ہے۔ کملا پرشاد کے دونوں ہاتھ
ہاتھوں میں لیے کر وہ رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں دکھائی دینے
لگیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کملا پرشاد کو چھاتی سے لگا کر اپنا دل ٹھنڈا کرے۔ لیکن
ایسا نہ ہو سکا۔ وہ تھک کر چارپائی پر گر پڑا۔
کملا پرشاد چپ چاپ اس کے دل کے جوش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل
بھی پگل رہا تھا۔ وہ اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکو نے دوبارہ اس کا ہاتھ اپنے
ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے دل میں طرح طرح کی باتیں آنے لگیں لیکن بولا نہ گیا۔
وہ سوچنے لگا جن لوگوں کے لئے میں نے مصیبت کو مصیبت نہیں سمجھا
جن لوگوں کی جان بچانے کے لئے اپنی جان تک دیتے ہیں میں نے کبھی دریغ
نہیں کیا تھا۔ وہ ہی میرے ساتھی آج میری اس بیماری میں میرا سارا دھن چھین
کر مجھے موت کے گہرے غار میں دھکا دے گئے ہیں اور جس کو میں جان سے
مارنے کے لئے تیار تھا۔ اُسی نے آکر آج میری جان بچائی ہے۔ یہ سوچتے

سوچتے اس کا دل ہائے ہائے کرنے لگا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا ہائے میں بڑا پاپی ہوں۔

اس کے بعد ڈاکو کچھ عرصے تک چپ چاپ پڑا رہا۔ گویا وہ اندر سے بولنے کے لئے کچھ طاقت جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کملا پرشاد کے چہرے کی طرف دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ بولا۔ مجھ جیسا پاپی اس دنیا میں دوسرا نہیں ہے، تمام مخلوق میں ذلیل ہوں۔ اس کے بعد اس نے اپنی داستان کہنی شروع کی۔ کملا پرشاد سننے لگا۔ جس قدر رات گذرنے لگی۔ اسی قدر گھر میں اندھیرا زیادہ ہی زیادہ ہونے لگا۔ باہر کی ہوا درختوں کے ہر ایک پتے سے ٹکرا ٹکرا کر ہائے ہائے کر رہی ہے۔ ڈاکو اپنی داستان رکتے ہوئے گلے سے برابر کہہ رہا ہے۔ اور اسے کملا پرشاد بڑے غور سے سن رہا ہے۔

اس کا سینہ چاک چاک ہو رہا تھا۔ جس وقت ڈاکو اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کی بات کہتے کہتے رونے لگا۔ اس وقت کملا پرشاد یک دم چونک پڑا اور ڈاکو کی چھاتی سے لپٹ کر روتے روتے چلا اٹھا۔ بھیا۔ بھیا۔ ڈاکو پہلے تو حیران ہو کر کملا پرشاد کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لیکن اُسی وقت بے قرار ہو کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے اور اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ گھر کے چراغ کی دھیمی روشنی گویا یکایک تیز روشن ہو گئی۔

چوری

جب شام قریب آئی۔ تو طوفان بھی پورے زوروں پہ ہوگیا۔ زور کی
بارش ہو رہی تھی۔ اور بجلی ایسے غیظ و غضب سے کڑک رہی تھی۔ خیال ہوتا تھا
کہ آسمان پر اسروں اور دیوتاؤں کے مابین جنگ ہو رہی ہے۔ سیاہ بادل بُھوت
کے جھنڈوں کی طرح اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔ گنگا کی لہریں تھپیڑیں مار رہی
تھیں۔ دریا کے کنارے باغوں میں جو درخت اُگے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہوا
کے زور سے مست ہو کر جھوم رہے تھے۔ ایک خاوند اور بیوی اپنے امیرانہ
مکان کے ایک بند کمرے میں جو مقام چندر نگر دریا کے کنارے واقع ہے۔
بیٹھے تھے۔ گھر واپس جانے کے بارے میں سنجیدہ بحث ہو رہی تھی۔ گھر پہ
بیوی سخت بیمار ہوگئی تھی۔ اس لئے اس کا خاوند جس کا نام شارت تھا۔
تبدیلی آب و ہوا کے لئے اسے دریا کے کنارے لے آیا تھا۔ بیوی مسماۃ

کیرن کو تبدیلی آب و ہوا سے شفا ہو گئی تھی۔ مگر دریا کے کنارے اس خوبصورت مکان میں کیرن کے لئے نہ کوئی سوسائٹی تھی۔ اور نہ کوئی تفریح طبع کا سامان تھا۔ تمام دن سوائے کھانا یا دوا کھانے کے کوئی کام نہ تھا۔ اور اس سے وہ متنفر یا متفکر ہو گئی تھی۔ کیرن کی بڑی خواہش تھی کہ گھر واپس جا کر اپنے پڑوسیوں کی دلکش صحبت میں وقت گزار کر محظوظ ہو۔ مگر اس کے خاوند کی یہ رائے تھی کہ جب تک اس کی صحت و طاقت مکمل طور پر بحال نہیں ہو لیتی تب تک کچھ مدت اور ٹھیرے۔

ان دونوں میں اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی۔

"اور کچھ دن یہاں رہنے میں تمہیں بالکل آرام ہو جائے گا۔"

"مجھے بالکل آرام ہے اب میں جانا ہی چاہتی ہوں"

جن لوگوں کی شادی ہو چکی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں۔ یہ بات چیت جو یہاں اتنی مختصر لکھی گئی ہے وہ اتنی مختصر نہ تھی۔ مضمون کچھ ایسا نہ تھا۔ جسے اتنا طول دیا جاتا۔ مگر پھر بھی بات کچھ سمجھ لی گئی۔

آخر میں جب کیرن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تب بشارت نے کہا۔

"مجھے تو واپس چلے جانے میں کوئی اعتراض نہیں مگر ڈاکٹر کہتے ہیں۔ کہ ابھی چند دن رہنا لازمی ہے۔"

"ڈاکٹر تو اپنی فیس کے لئے ایسا کہتے ہی رہیں گے۔"

"یہ بات نہیں دراصل ان دنوں دیہات میں بہت سی بیماریاں پھیل جاتی ہیں۔ اس لئے اس نے رائے دی ہے کہ ابھی دو ماہ یہاں رہو۔"

"شاید آج کل شہر میں کوئی بیماری نہیں"۔
اس جگہ ماضی کا کچھ حال لکھ دینا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کیرن کو اس کے گھر کے تمام افراد گاؤں کی عورتیں یہاں تک کہ ساس بھی بہت اچھا سمجھتی تھی یہی وجہ تھی کہ جب کیرن بیمار ہوتی تو اسے بہت فکر دامن گیر ہوتی۔ ڈاکٹر نے ہوا تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ بشارت اسی وقت تیار ہو گئے۔ ساس نے کوئی روک ٹوک نہ کی بلکہ ضرورت کے لئے خود ساتھ تیار ہو گئی۔
بشارت بیوی کو ساتھ لئے ہوئے شہر میں آ رہا اور لب دریا باغیچہ والے ایک مکان میں رہنے لگے۔ ڈاکٹر کی دوائی سے اب بہت آرام ہے۔ صرف کمزوری باقی رہ گئی ہے۔
کیرن جب تک اپنے خاوند کو جواب دیتی رہی رنجت تک برابر بحث ہوتی رہی۔ آخر جب کیرن نے بالکل خاموش رہ کر خاوند کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس وقت بشارت کو ہار ماننی پڑی۔
اسی وقت ایک نوکر پیغام لایا جس سے بشارت کو معلوم ہوا کہ دریا میں طوفان کے باعث ایک کشتی اُلٹ گئی ہے۔ ایک نوجوان برہمن لڑکا جو اس کشتی میں سوار تھا۔ وہ تیر کر کامیابی سے اس کے باغ کے زینے پر کنارے آ لگا ہے۔
لڑکے کے آنے سے اُسے خوشی ہوئی اور اس کے ساتھ مشفقانہ سلوک کیا اس لڑکے کے بال لمبے لمبے اور گھونگریالے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت تھیں مگر اس کے چہرے پر داڑھی کی کوئی علامت نہ تھی۔ کیرن نے اُسے دودھ

پلایا۔ اور سب حال پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے۔ دریا کے راستے کہاں جا رہے تھے۔ کیا کام کرتے ہو" وغیرہ وغیرہ کئی سوال دریافت کئے۔ لڑکے نے کہا:-

"کہ میرا نام نیل کنٹھ ہے۔ میں ایک ناٹک کمپنی میں ملازم ہوں۔ جب ہم دریا عبور کر رہے تھے تو ہمیں طوفان نے آ گھیرا۔ اور میں بمشکل تیر کر بچا۔ میرے ساتھیوں کا خدا جانے کیا حال ہے"۔

اس لڑکے کو اپنے ہاں رکھنے میں سب خوش تھے۔ کرن کی اس کے ساتھ اس لئے ہمدردی تھی کہ وہ مشکل سے بچا تھا۔ شارت اس کا آنا اس لئے مبارک سمجھتا تھا کہ اس کی دل بہلانے والی صحبت اس کی بیوی کو کچھ عرصہ اور یہاں رہنے کی ترغیب دے گی۔ شارت کی ماں اس سے اس برہمن کے لڑکے پر مہربانی کر سکے۔ نیل کنٹھ بھی خوش تھا کہ ایک تو مرنے سے بچا۔ دوسرے اپنے پرانے مالک سے نجات ملی۔ اور ایک امیر کے گھر رہنے کو جگہ مل گئی۔

مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد شارت اور اس کی والدہ کی رائے بدل گئی۔ اور وہ چاہنے لگے کہ کسی طرح نیل کنٹھ چلا جاوے۔ وجہ یہ تھی چونکہ اس گھر میں اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لئے اس کی عادات بہت بگڑ گئیں چپکے چپکے وہ شارت کا حقہ پینے لگا۔ کبھی اس کا ریشمی چھاتہ لے کر جب مینہ برس رہا ہوتا تو گاؤں کی سیر کرنے کے لئے چلا جاتا۔ اور ایک سے جسے وہ ملتا۔ دوستی گانٹھتا پھرتا۔ علاوہ ازیں ایک کتا اس نے کہیں سے لے لیا

تھا جسے وہ بہت پیار کیا کرتا تھا۔ یہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے جوتوں سمیت اندر آکر شارت کے بستر پر بیٹھ جاتا۔ یہاں تک ہی نہیں۔ نیل کنٹھ نے لڑکوں کا ایک گروہ جمع کر لیا جس میں ہر ایک قسم اور قد و قامت کے لڑکے شامل تھے۔ اس گروہ کی کارگزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال وہاں ایک آم بھی نہ پکنے پایا۔

الغرض نیل کنٹھ جو چاہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بگاڑنے میں کیرن کا بھی ہاتھ تھا۔ شارت اکثر بیوی کو ایسا کرنے سے باز رہنے کو کہتا۔ مگر وہ کچھ پرواہ نہ کرتی۔ بلکہ نئے نئے کپڑے پہنا کر اس نے نیل کنٹھ کو بہت شوقین بنا دیا تھا۔ اور چونکہ کیرن کو اس سے رغبت تھی۔ اس لئے وہ اکثر اُسے اپنے کمرے میں بلاتی رہتی تھی۔ نہانے اور دوپہر کا کھانا کھا چکنے کے بعد جب وہ پاندان لے کر پلنگ پر بیٹھتی تو کنیز اس کے بالوں میں کنگھی کرتی۔ اور نیل کنٹھ سامنے کھڑا ہو کر طمطراق سے گیت گا کر سناتا۔ شارت کو یہ پسند نہ تھا۔ وہ اکثر نیل کنٹھ کی گوشمالی کیا کرتا تھا۔ مگر نیل کنٹھ کو اس مار پیٹ کی چنداں پرواہ نہ کی تھی۔ اس لئے کہ یہ اس سزا کے مقابلے میں جو اس کی سابقہ زندگی میں اس کے تجربے میں آتی تھی۔ بڑی ہلکی تھی۔ پس وہاں اس نے خوب جسمانی نشوونما پائی۔

نیل کنٹھ کی آمد کے تھوڑے عرصے بعد شارت کا چھوٹا بھائی سائنس اپنی کالج سے تعطیلات گزارنے کے لئے ان کے پاس آیا۔ کیرن اس کی صحبت سے بے حد خوش تھی۔ اس لئے کہ وہ زندہ دل اور اس کا ہم عمر تھا۔

وہ اپنا وقت خوشی سے کھیلنے جھگڑنے ۔ صلح صفائی کرانے کرنے ہنستے اور رونے میں گزارتے تھے۔ وہ مذاق بھی کیا کرتے اور طرح طرح کے الڑکھے طریقے سے ایک دوسرے پر مسخر اڑاتے تھے ۔ان ایام میں نیل کنٹھ ایسا تلخ ہو گیا کہ اس نے اپنے جاں نثار ہمجولی لڑکوں اور پالے ہوئے کتوں کو مار کر بھگا دیا۔ اس کا رویہ اس لئے بدل گیا تھا کہ کیرن اس کی طرف رُخ نہیں کرتی تھی۔ اور اس کا اعتقاد ہو گیا۔ کہ سائش نے کسی مکرو فریب سے اس کے خلاف کیرن کے کان بھر دیئے ہیں۔ اور اس کو سرد مہر بنا دیا ہے بس وہ سائش کا دشمن ہو گیا۔ لیکن اس میں جرأت نہ تھی کہ اپنے عناد کا علانیہ اظہار کرے۔ پھر بھی وہ اس سے اپنا بدلہ لینے کے لئے سینکڑوں تدابیر نکالتا تھا۔ سائش کو تنگ کرنے کے لئے اس نے بہت سی شرارتیں کیں۔ آخر کار جب کنبے کے ممبران کا واپس جانے کا وقت آیا تو کیرن نے نیل کنٹھ کو ساتھ لے جانے کی تجویز کی۔ مگر اس کی تجویز کی سخت مخالفت ہوئی۔ اور اس نے نیل کنٹھ کو اپنے گھر لوٹ جانے کی صلاح دی۔ وہ زار زار رو دیا۔ سائش نے اس کے برخلاف ایسی آواز اٹھائی کہ نیل کنٹھ بلد ان سے رخصت ہوا۔ وہ غصّے سے آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ اور بے سود سوچتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح سائش کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ مگر اس کا حاسد دل اپنا ہی خون پیتا رہا۔

سائش کی بڑی خوبصورت دوات کلکتہ سے لایا تھا۔ اتفاقاً یہ دوات ان کی روانگی سے ایک دن پہلے گم ہو گئی۔ سائس غصّے سے بھر گیا۔ اس کو

شک تھا کہ یہ نیل کنٹھ نے چرالی ہے۔ اس نے نیل کنٹھ کو اپنی بھاوج کے

سامنے بلوایا۔ اور اس سے کہا۔

"چرائی ہوئی شے واپس کردو"

نیل کنٹھ کی آنکھیں غصّے کی تیزی سے سُرخ ہوگئیں۔ پھر کیرن اس

کو ایک طرف لے گئی۔ اور اس سے پوچھا۔

"کیا یہ وہ بات تم نے چرائی ہے۔ اور اس سے کہا کہ اگر یہ چیز چپکے

سے دے دو گے تو میں راز افشا نہ ہونے دوں گی"۔

نیل کنٹھ کچھ نہ بولا اور صرف زار زار رو دیا۔ کیرن کا جو نیل کنٹھ پر چوری

کا شبہ تھا۔ وہ جاتا رہا۔ مگر شارت اور ساتیش کے دل نے یہ الزام بعینہٖ

قائم رکھا۔ دونوں بھائیوں نے یک زبان ہوکر کہا۔

"نیل کنٹھ کے سوا دوسرے کا یہ کام نہیں"۔

"کبھی نہیں" کیرن نے اپنے الفاظ میں خاص جوش پیدا کرتے ہوئے

جواب دیا۔

شارت نے نیل کنٹھ کو بلایا۔ اور کچھ سوالات کرنے چاہے۔ مگر کیرن

نے راستہ میں ہی روک کر کہا

"نہیں چوری کے متعلق تم اسے کچھ نہیں پوچھ سکتے"۔

"اس کا کمرہ اور بکس کھول کر دیکھنا چاہئیے"۔

"اگر ایسا کرو گے تو میں تمام عمر تم سے بات نہ کروں گی بے گناہ پر اس

قسم کا شک کرنا اچھا نہیں"۔

یہ کہتے کہتے کیرن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کے بعد کسی نے نیل کنٹھ کو کچھ نہیں کہا۔

کیرن ان کی بات کا اعتبار کرنے سے ایسی مستقل طور پر منکر رہی کہ نہ تو اس نے لڑکے کی یک طرفہ شہادت گزرنے دی، اور نہ اس کے کمرہ اور صندوق کی تلاشی ہونے دی۔ اس بے خانماں لڑکے کی سخت ہتک پر کیرن کو بڑا ترس آیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ دو نئے کپڑوں کے سوٹ اور ایک جوڑا جوتا اور قطعہ نوٹ بطور تحائف خبر کئے بغیر نیل کنٹھ کے صندوق میں آج وقت شام رکھ دے۔ چونکہ یہ کام صندوق کی ان اشیاء کے جن سے وہ پُر تھا نکالے بغیر وہ نہیں کر سکتی تھی۔ ساتھ ہی اسے وہ اشیا مع عطیوں کے مناسب طور سے دوبارہ بکس کے اندر بند کرنی بھی ضروری تھیں۔ پس جب وہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنا رہی تھی۔ اتفاقیہ گم ہوئی دوات اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ حیران و ششدر رہ گئی۔ لیکن اس نے جلدی ہی دوات اور دیگر اشیا دوبارہ رکھ دیں۔ اور سب سے اوپر پھر دوبارہ رکھے اور انہیں منتقل کر دیا۔ اس اثنا میں نیل کنٹھ چپکے سے کمرے کے اندر پیچھے سے دبے پاؤں آ گیا تھا۔ اس نے بغیر خبر کئے کیرن کی کارروائی کو دیکھ لیا تھا۔ اگلے روز نیل کنٹھ ایسا فرار ہوا کہ کوئی اس کو نہ پا سکا۔ تیسرے دن پولیس نے بھی کہہ دیا کہ اس کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ اب شارت کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس کا بکس کھول کر دیکھنا چاہیئے۔

"کسی طرح نہیں ہو سکتا" کہہ کر کیرن بکس اپنے کمرے میں اٹھا کر لے آئی

اور شب کی سیاہی میں اس دوات کو دریا کے گہرے پانی میں پھینک دیا۔

کیرن نے اس کی چوری معلوم نہ ہونے دی۔ پھر سارا خاندان رخصت ہو گیا۔ ایک ہی دن میں باغ اجڑ گیا۔ صرف نیل کنٹھ کا کتا دریا کے کنارے بھونکتا پھرتا رہا۔ اس کی آہ وزاری سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل ٹوٹ گیا ہے ۔

مصوّر

تصویر کھینچنا ہی اس کی زندگی کا مدعا ہے۔ شاعر جس طرح شعر کو پڑھ
کر آواز میں قافیہ اور ردیف کو ملا کر شاعری کے ذریعہ اپنے دل کا خیال
ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح چھبی ناتھ اپنی رنگین قلم سے رنگ بھر کر اور خطوط کھینچ
کر اپنے دل کا خیال تصویر میں صاف طور پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اس کی بنائی
ہوئی تصویریں ایسی خوبصورت اور قدرتی ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر اصلی
چیز کا شبہ ہوتا ہے۔ آسمان میں پرندہ اڑتا ہے۔ اس کی کھینچی ہوئی تصویر
دیکھ کر اسے لوگ جھٹ پٹ نہیں بتا سکتے کہ یہ دراصل جانور ہے یا اس کی تصویر
ہے۔ مصوری میں اس کی ایسی ہوشیاری دیکھ کر دیش کے سارے مصوّر
دل ہی دل میں اس سے نفرت رکھتے ہیں لیکن چھبی ناتھ کے دل میں حسد و
نفرت ذرا بھی نہیں ہے۔ اس کا دل دودھ کی مانند صاف ہے۔ وہ بچوں کی

طرح ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

چھبی ناتھ ایک اعلیٰ درجہ کا مصوّر ہے۔ اس کی لیاقت کو عام لوگ نہیں جان سکتے۔ صرف مصوّر ہی اس کے اوصاف سے واقف ہیں لیکن وہ اس بات کو ظاہر نہ کر کے اپنے ہی نام کے بڑھانے میں دل وجان سے کوشش کرتے ہیں۔ چھبی ناتھ تصویر کھینچنے میں مصروف رہتا ہے۔ اسے تعریف حاصل کرنے کی ذرا بھی خواہش نہیں ہے۔

ایک دفعہ راجہ کے دربار میں یہ سوال پیدا ہوا کہ تمام ملک میں سب سے عمدہ مصوّر کون ہے۔ اس امر کی تحقیق کے لئے راجہ نے ملک کے سارے مصوّروں کو مقرّرہ وقت پر حاضر ہونے کا حکم دیا۔

مصوروں نے سوچ کر آپس میں فیصلہ کر لیا کہ دیہات کے رہنے والے چھبی ناتھ کو راجہ کا حکم کسی طرح معلوم نہ پائے۔ وہ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر تصویروں کی نمائش گاہ میں چھبی ناتھ کی تصویر آئے گی۔ تو ہم لوگوں کی امید کا پھول کر جائے گا۔ اور اس کو ہی فتح نصیب ہو گی۔

رفتہ رفتہ مقررہ وقت بھی آپہنچا۔ سب لوگ راجہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ صرف چھبی ناتھ ہی اس دربار میں حاضر نہیں ہوا۔

راجہ نے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ میں اس امر کی آزمائش کرنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے سب سے عمدہ مصوّر کون ہے۔ اس لئے شروع سال کے اوّل روز تم سب لوگ ایک ایک عمدہ تصویر تیار کر کے دربار میں حاضر ہو جاؤ۔ ان تصویروں کے ذریعہ ہی یہ امر تحقیق کیا جائے گا۔

راجہ کا حکم سن کر مصور خوشی سے اپنے اپنے گھر واپس گئے۔ انہوں نے دل ہی میں یہ ارادہ کیا کہ چھبی ناتھ کو اس بات کی مطلق خبر نہیں ہونی چاہئے۔

ایک ۵ سال کا بچہ ندی کے کنارے کھیل رہا ہے۔ کھیلتے کھیلتے جب وہ آگے پیچھے دوڑتا ہے تو اس کے سیاہ بال ہوا کے جھونکوں سے اڑ اڑ کر نہایت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں دو کھلے ہوئے نیلے کنول کے مانند خوبصورت اور دلکش معلوم ہوتی ہیں۔

چھبی ناتھ دیکھتے دیکھتے ندی پر آپہنچا۔ وہ ایک عمدہ تصویر کھینچنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے دل کے مطابق نمونہ نہیں ملتا تھا۔ بچہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اسے اس کی مرضی کے مطابق نمونہ مل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس جاکر دریافت کرنے لگا۔

چھبی۔ تمہارا کیا نام ہے!

بچہ (ہنس کر) منوہر

چھبی ناتھ دل میں بڑا خوش ہوا کہ نام بھی ٹھیک ہے۔ منوہر در اصل منوہر ہی ہے۔ بڑی کوشش اور لالچ سے اس بچے کو اس نے ایک پتھر پر بٹھایا۔ بچہ ہنستے ہنستے کہنے لگا۔ بھائی یہ تصویر مجھے دوگے؟

چھبی۔ تیار ہونے پر یہی تصویر میں تمہیں دوں گا۔ لیکن اس کے تیار کرنے میں دو تین دن لگیں گے۔

تم روز ٹھیک وقت پر یہاں آجایا کرو۔

بچہ خوش ہو کر، بہت اچھا

چھیدی ناتھ نے جیب سے قلم اور رنگ نکال کر تصویر کھینچنا شروع کیا۔ تیسرے دن تصویر تیار ہو گئی۔ بچہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مصوّر کا ہاتھ پکڑ کر بڑی منت سے اسے اپنے گھر لے گیا۔ منوہر کا والد بھی اس منوہر تصویر کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ آہ میرے لڑکے کی تصویر ایسی خوبصورت! پہلے تصویر کی طرف دیکھ کر اور پھر اپنے لڑکے کا منہ دیکھ کر وہ دنگ ہو گیا۔ اور خوشی میں اس قدر محو ہو گیا کہ چھیدی ناتھ کی خاطر تواضع کرنا بھی بھول گیا۔

آج نئے سال کا پہلا دن ہے۔ راجہ کا دربار پھولوں سے آراستہ ہو رہا ہے۔ دربار کے میدان میں عمدہ راج سنگھاسن بچھا ہوا ہے۔

دائیں طرف ایک خوبصورت غالیچے پر انصاف کے خواہشمند مصور لوگ اپنی اپنی تصویر لئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ سامنے کی طرف تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔

ملک کے تمام مصوّر راجہ کے دربار میں حاضر ہیں۔ چھیدی ناتھ کو اس کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ لیکن وہ جان کر بھی آج اس دربار میں نہیں آیا۔

تصویروں کا امتحان شروع ہونے میں اب زیادہ نہیں ہے۔ ایسے وقت پر ایک آدمی ہانپتا ہوا راجہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھیدی ناتھ کی کھینچی ہوئی منوہر کی تصویر ہے۔ سب لوگ اس آنے والے شخص کی طرف دیکھنے لگے۔ راجہ کے اشارے سے پہرے والوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ اس نے آ کر اور تصویر پیش کر کے عرض کی۔ مہاراج میں بھی انصاف کا خواہشمند

ہوں۔ یہ تصویر امتحان کے لئے لایا ہوں۔
تصویروں کا امتحان شروع ہو گیا۔ راجہ نے ایک ایک کر کے سب تصویروں کا ملاحظہ کیا۔ اور آخر میں منوہر کی تصویر کو دائیں ہاتھ سے اٹھایا انہوں نے بہت عرصہ تک اس کا ملاحظہ کر کے بلند آواز سے کہا کہ جس نے یہ تصویر کھینچی ہے وہی۔۔۔ سب مصوّروں میں۔۔۔ سے عمدہ مصوّر ہے۔
سب لوگ اُس کی تصویر کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک ہی ساتھ دربار کے موجودہ حاضرین کی نظر اُسی تصویر پر جا پڑی۔ سب ہی تعجّب سے دیکھنے لگے کہ ندی کے کنارے پر ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے خوبصورت نازک بچّہ کی عجیب تصویر ہے۔ اس میں ذرا بھی بناوٹ معلوم نہیں ہوتی۔ اس تصویر کو دیکھ کر تصویر سے بچّے کو گود میں لینے کے لئے تماشائیوں کے دونوں ہاتھ خودبخود ہی آگے کو بڑھتے ہیں۔
راجا:۔ (منوہر کے والد سے) اس تصویر کے بنانے والے کا کیا نام ہے۔ اور وہ کہاں ہے؟
منوہر:۔ اس کے بنانے والے کا نام مجھے معلوم نہیں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے لیکن یہ تصویر میرے بچّے کی جیتی جاگتی ہوبہو اصل مورت ہے۔ ایسی منوہر تصویر میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اسی لئے مہاراج کی خدمت میں اسے غور کرانے کے لئے لایا ہو
بہت کچھ جستجو کرنے پر بھی مصوّر کا پتہ نہیں لگا۔ راجہ نے منوہر کے والد کو بہت کچھ انعام دے کر اس تصویر کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اُس روز کچھ بھی

فیصلہ نہ ہوسکا۔

راجہ نے فیصلہ کے خواہش مند مصوروں کو بلا کر کہا تم لوگوں میں کون سب سے عمدہ مصور ہے۔ اس امر کا فیصلہ کچھ بھی نہ ہو سکا۔ اس لئے دوبارہ تصویر بنا کر لاؤ میں پھر غور کروں گا۔

آج دوبارہ تصویروں کے امتحان کا دن ہے۔ راجہ لباس شاہی پہن کر رانی کے ہاتھ کی گُندھی ہوئی پھولوں کی مالا کو گلے میں ڈال کر گدی پر براجمان ہیں پیچھے تخت کے اوجھل میں شاہی خاندان کی مستورات کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔

اس دفعہ نامعلوم کیا سوچ کر چھبی ناتھ تصویروں کی نمائش دیکھنے کے لئے آیا ہے۔ راجہ کے دربار میں ایک طرف تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے وہاں پر ہی وہ بیٹھا ہے لیکن کسی نے اس کو نہیں پہچانا۔

راجہ کے سامنے تصاویر رکھی گئیں ہیں۔ سب لوگ آج کا فیصلہ سننے کیلئے خواہشمند ہو رہے ہیں۔ غور کرنا شروع ہو گیا۔ ایسے وقت چھبی ناتھ کی نظر راج محل کے کونے میں لٹکتی ہوئی ایک تصویر پر پڑی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور تصویر کی طرف رخ کیا۔ کسی نے بھی اس طرف نگاہ نہ کی۔ سب لوگ تصویروں کی نمائش دیکھنے میں مشغول ہو رہے ہیں۔ راجہ نے یکے بعد دیگرے سب تصاویر کا معائنہ کیا۔ آخر میں انہوں نے ایک تصویر اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لی ہی تھی کہ اتنے میں چور چور کی آواز سے راجہ کا دربار گونج اٹھا۔ راجہ نے دیکھا کہ وہ پہرے دار ایک آدمی کو باندھے ہوئے لئے آتے ہیں۔

پہرے والوں نے راجہ سے عرض کی کہ مہاراج یہ منوہر کی تصویر چرانے گیا تھا۔

راجہ نے بغور تیکھی نگاہ سے مصیبت زدہ چہرے کا معائنہ کیا۔ وہ سر جھکائے قائم مزاجی سے کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر خوف کا نام تک نہیں ہے۔ تماشائیوں کے شور وغل سے سبھا منڈپ کانپنے لگا۔ راجہ کے نظر ڈالنے سے کچھ دیر میں خاموشی ہو گئی۔

راجا (قیدی سے) تم محل میں کیوں داخل ہوئے۔؟

قیدی۔ (بے خوف ہو کر) تصویر دیکھنے کے لئے۔

راجہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اتنے میں منوہر کے والد نے آکر کہا مہاراج یہ وہی مصور ہے جس نے میرے لڑکے منوہر کی تصویر کھینچی ہے۔

تماشائیوں میں سناٹا چھا گیا۔ تمام دربار میں خاموشی چھا گئی۔ لوگ خواہش مند ہو کر فیصلہ سننے کی انتظار کرنے لگے۔

قیدی کی بیڑیاں کھول دی گئیں۔ راجہ نے سنگھاسن سے اٹھ کر رانی کے ہاتھ کی گندھی ہوئی پھولوں کی مالا اپنے گلے سے اتار کر مصور کے گلے میں ڈال دی۔

جے کا باجہ بجنے لگا۔ چتا کے اندر سے جے کے راگ سنائی دیئے۔ راجہ کے فیصلہ سے سب لوگ خوش ہوئے۔ صرف جن لوگوں نے فیصلہ کرانا چاہا تھا وہی گردن جھکائے بیٹھے رہے۔

آزمائش

ایک چھوٹا سا لیکن خوبصورت پائین باغ ہے۔ بسنت کے موسم نے نئے نئے پھول اور پتوں کی شکل میں آسمانی لباس اور زیورات کی نذر دے کر اسے اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ علی الصباح ہی شیریں آہستہ اور خوشبودار ہوا چل رہی ہے۔ آم کے درختوں کی ڈالیوں پر بیٹھی ہوئی کوئلیں اپنی شیریں اور سریلی آواز سے شانتی پاٹ پڑھ رہی ہیں۔ اور پرندے خوشی کی آوازیں نکالتے ہوئے ایک ڈالی سے دوسری اور دوسری سے تیسری ڈالی پر آزادانہ کلکاریاں کر رہے تھے۔

ایک جامن کے درخت کے نیچے بھگوان بدھ دیوجی دھیان میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی شانت اور تیز بظاہر صورت دیکھ دیکھ کر بڑے بڑے لامذہب اشخاص کی پیشانی بھگتی بھاؤ سے جھک جاتی ہے۔ جنگل کے

درندے جانور بھی اپنی بے رحمی کو بھول کر اس کے پاکیزہ جسم کو چھوتے ہوئے چلے جاتے ہیں جس کسی شخص کی غصہ وغیرہ کی خرابیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس کے اثر سے بُرے سے بُرے جاندار وں کا اچھا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ایک ہرن کا بچہ پدم آسن سے بیٹھے ہوئے بدھ دیو کی ران پر سر رکھے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہے۔ یکایک اس نے اپنا سر اونچا کیا اور نتھنے پھلائے۔ خشک پتوں پر سے آنے والے شخصوں کے قدموں کی دھیمی آہٹ سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر میں درختوں کی اوجھل میں سے چند آدمیوں کی ایک ٹولی باہر آئی۔ اس ٹولی کا سر گروہ ایک نوجوان شخص تھا جس کے چہرے سے عظمت اور جلال نمایاں تھا۔ اور جس کے بدن پر قیمتی لباس اور زیور چمک رہے تھے

اس نوجوان نے اپنے ہمراہیوں کو دور رہنے کا اشارہ کیا۔ اور آپ تنہا بدھ دیو کے پاس آیا۔ اس مہاتما کے پاس پہنچتے ہی وہ دست بستہ آداب بجا لایا۔ اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

اس وقت بدھ دیو اگرچہ اپنی پہلی ہی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی نظر اس نوجوان کی طرف تھی۔

بہت دیر تک انتظار کر کے نوجوان بولا۔ ہے بھگوان میری نمسکار قبول ہو۔ میں بہت دور سے آیا ہوں۔ میرا نام چتر سنگھ ہے۔ میں پچھنب راج کا ولی عہد ہوں۔ اور آپ کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے یہاں

آیا ہوں جس دن سے میں نے آپ کی تعریف سنی ہے۔ اسی روز سے میرا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ مجھے دھن و دولت سے نفرت ہو گئی ہے۔ خواہشاتِ نفسانی سے میرا دل غمگین رہتا ہے۔ اپنی پیاری عورتوں اور دوستوں سے اب مجھے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ مجھے روحانی علم سے محبت ہو گئی ہے۔ اس لئے آپ مہربانی فرما کر مجھے روحانی علم کا اُپدیش دیجئے۔

بھگوان بدھ دیو نے راج کمار کی طرف مہربانی کی نظر سے دیکھا۔ لیکن مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ راج کمار پھر بولا۔ ہے بھگوان کیا آپ میرے دکھی اور بے قرار دل کو اپنے شیریں کلام کے چند الفاظ سے پھر شانت نہیں کرو گے؟ کیا میں آپ کی مہربانی کی نظر کے قابل نہیں ہوں؟ ہے سوامی! میں نے اپنی زندگی بچپن سے لے کر اب تک پاکیزگی کے ساتھ بسر کی ہے۔ دھرم شاستروں کے خلاف میں نے آج تک کبھی خواب میں بھی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ اپنے دیش کی رسم و رواج کی میں نے اچھی طرح پابندی کی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے دھرم کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے کیا میں آپ کا چیلا ہونے کے لائق نہیں ہوں۔

نہیں۔

بس اتنی ہی بات بدھ دیو کے مُنہ سے نکلی تھی۔ پربھو اگر ایسا ہے تو آپ کا چیلا ہونے کی لیاقت مجھ میں کب آئے گی۔ اور میں کیا کروں جس سے اس قابل ہو سکوں۔

کھوج کرو۔ کھوج کرنے سے تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ مجھے کیا

کرنا چاہئے۔

راج کمار نے اُداس ہو کر دریافت کیا۔ کیا کھوج کردوں؟

بدھ دیو کی طرف سے جب اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ تب ولی عہد نے کہا۔ حضور کا حکم مجھے بسر و چشم منظور ہے میں کھوج کروں گا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان میرا امتحان لے رہے ہیں۔

بدھ دیو نے کہا۔ ممکن ہے۔ ہو سکتا ہو۔

اچھا تو اب میں آپ کے درشن کے لئے پھر کب آؤں کیا حکم ہے۔

چھ ماہ کے بعد۔

راجکمار بدھ دیو کے قدموں میں نمسکار کر کے خاموش وہاں سے چل دیا۔ اس کے ساتھیوں کی ڈولی ساتھ ہو لی۔ سب جگہ امن و امان کی سلطنت ہو گئی۔ ہرن کا بچہ اس فرشتہ سیرت شخص کی رات کے سہارے پھر آرام کرنے لگا۔ بدھ دیو پھر دھیان میں لگ گئے۔

پہلی سرگزشت کو گزرے ہوئے آج پورے چھ ماہ ہو گئے۔ وہی جگہ وہی پائین باغ وہی جامن کا درخت اور اسی درخت کے نیچے پہلے ہی کی طرح بیٹھے ہوئے بھگوان بدھ دیو دھیان میں لگے ہوئے ہیں۔ سورج ابھی غروب ہوا تھا۔ ہوا حسب معمول چل رہی تھی۔ ایک بڑا بھاری طوفان آنے کی علامت نظر آتی تھی۔ جنگلی جانور خوف زدہ ہو کر اس فرشتہ صورت کی پناہ میں آ رہے تھے۔ پرندے درختوں پر چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ اور دردناک آواز سے چہچہاہٹ کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ آندھی اور بارش کے زور سے درخت اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگے۔ لیکن اس جامن کے درخت پر اس آندھی اور بارش کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بھگوان بدھ دیو کے جسم پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پڑا۔ ایسا کون ہے جو مہاپرشوں کے مضبوط اعتقاد کی جڑ کو ہلا سکے۔

اس خوفناک آندھی اور بارش کی کچھ پرواہ نہ کر کے وہ پہلے کا واقف راجکمار مقررہ تاریخ کو اس مقدس جگہ میں آیا۔ اور بدھ مہاتما کو دست بستہ نمسکار کر کے بولا رہے بھگوان! میں بڑی آرزو سے آج کے دن کی انتظار کر رہا تھا۔ ایک ایک دن اور رات گنتا رہا ہوں۔ تب کہیں یہ دن نصیب ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے امتحان میں پورا اُتر چکا ہوں۔ آپ کی کسوٹی پر میرا چال چلن اصلی سونا ثابت ہو گیا ہو گا۔ میں نے اپنی زندگی کا سلسلہ بہت ہی پاک وصاف رکھا ہے۔ خواہشات نفسانی کی پرواہ نہ کر کے میں نے مدت تک دھیان دھارنا پرانایام وغیرہ کئے ہیں۔ دھن و دولت کو حقیر سمجھا ہے۔ اور سب طرح کی جسمانی اور دماغی تکالیف برداشت کی ہیں۔ اب تو آپ مجھے اپنا چیلا بنانا منظور فرمائیں گے؟

جواب ملا۔ نہیں۔

اس جواب سے مایوس ہو کر راجکمار نے اپنا منہ دوپٹہ سے ڈھانپ لیا۔ رنج سے اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور بہت عرصہ

تک اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آخر کار گھبرائی ہوئی آواز سے
اُس نے کہا ہے بھگوان! کیا آپ اس غلام کے ساتھ کچھ گفتگو کرنے کی
مہربانی نہ فرمائیں گے؟ اور کیا یہ بھی نہ بتلائیں گے کہ آپ مجھے اپنا چیلا
کیوں نہیں بناتے ہیں؟۔

بدھ دیو نے دھیان چھوڑ کر کہا۔ اے معزز راجکمار یہ بیرونی
امتحان میں پاس ہو جانے سے ہی کوئی شخص دکھشا کے لائق نہیں ہو
جاتا۔ میں نے تم سے عورتوں کے اور دیگر آرام کے چھوڑنے کے لئے
نہیں کہا تھا۔ پہلے جنم کے موافق جس امتحان میں جس کسوٹی میں تمہیں پار
ہونا ہے۔ وہ تمہارے سبھاؤ کی ہے۔ اور اس میں تم پاس نہیں ہوئے
ہو۔ اپنے راج محل کو تم پھر واپس جاؤ اور نیک زندگی کو بسر کرتے ہوئے
شانتی کے آنند کو حاصل کرو۔ چیلے کی زندگی دھارن کرنے کی ابھی تم میں
لیاقت نہیں ہے۔

میں ان باتوں کو بیان کرتا ہوں۔ تمہارا پہلا امتحان لوگوں کی برائی
کو برداشت کرنا ہے۔ راجکمار ایک دفعہ تمہارے والد کے دربار میں
تم پر ایک ایسا جرم لگایا گیا تھا جو حقیقت میں جھوٹا تھا۔ وہ تمہیں یاد ہوگا
واقعی امر کیا ہے۔ اس بات کا حال آخر میں لوگوں کو معلوم ہو ہی جاتا۔
لیکن تم سے اتنا صبر نہ ہو سکا۔ کرم کے سبب مجرمان بھنگ ہونے کی جو مذکورہ
بالا بات تم پر آپڑی تھی۔ اسے تمہیں برداشت کرنا چاہئے تھا لیکن بیگناہ
ہونے کے لئے اور اپنی بے گناہی ثابت۔ . . . کرنے کے لئے تم بے قرار

ہو گئے اور اس کے لئے تم نے ہتھیار تک ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح اس
پہلے امتحان میں تم پاس نہیں ہوئے۔
راج کمار نے کہا۔ "اگر میں نے قصور کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ برداشت
کرنے کے لئے بھی میں تیار ہو جاتا۔ لیکن میں تو بے گناہ تھا!"
بد ھ بھگوان بولے جو آدمی نیک ہیں۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنیکی
کوشش کرتے ہی ہیں۔ اور انہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن جو میرا چیلا ہونا
چاہتا ہے۔ اور جو روحانی تحقیقات کے راستہ میں داخل ہونا
چاہتا ہے۔ اور جو روحانی سروپ کو ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اسے
لوگوں کی برائی سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔ اگر کوئی الزام لگایا گیا ہو تو اُسے
تحمل سے برداشت کرنا چاہیئے۔ اپنی نیک چلنی کا ثبوت دینے کے لئے
ایک لفظ بھی نہیں کہنا چاہیئے اور خواہ کوئی تمہاری تعریف کرے یا تم پر
الزام لگائے تمہیں دونوں حالتوں میں یکساں رہنا چاہیئے۔
راج کمار نے سر جھکا لیا۔
"بدھ دیو پھر فرمانے لگے۔ اور حسد کے باعث تم دوسرے امتحان میں
بھی فیل ہو گئے۔ تمہارا ایک دلی دوست تھا۔ تم دونوں میں بڑی دوستی تھی۔
تمہارے والد کے دربار میں کوئی اجنبی آیا۔ اور اپنی کچھ مطلب براری کے لئے
کوشش کرنے لگا۔ لیکن یہ تم کو برداشت نہ ہوا۔ تمہارے دل میں حسد کا
بیج پیدا ہو گیا۔ تم نے اس اجنبی شخص کو اپنے دوست کی محبت میں شریک
ہونے کے لئے دل و جان سے کوشش کی اور اپنے دل میں کینہ رکھا۔"

راج کمار بولا۔ جب مجھے معلوم تھا کہ اس اجنبی شخص کو صرف اپنا مطلب نکالنا تھا تب اپنے دوست کو اس کے دھوکا میں نہ پھنسنے دینے کی کوشش کرنا کیا میرا فرض نہ تھا۔

بدھ دیو نے کہا۔ وہ خود غرضی کی دوستی کیا آگے جا کر پاک اور بے غرض نہیں ہو سکتی تھی۔ تمہیں کیا اس امر کا پختہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ دوستی کسی وقت بھی صادق دوستی میں تبدیل نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ دنیا میں نیک اور اشراف اپنے دوست کی حفاظت اور دشمن کی حرکت کو بے سود کرنے کے لئے خواہ کتنی ہی کوشش کریں کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے چھپے ہوئے طریق اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے اپنے دل سے حسد اور خودی کو دور کر دینا چاہیئے یعنی اپنے دوست کو دھوکا دینے والے سے پھر حسد، بغض وغیرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہے راج کمار اپنے والد کے دھن و دولت اور اقبال سے تمہیں محبت نہیں ہے۔ خواہشات نفسانی بھی تمہیں اپنی طرف رجوع نہیں کر سکتی ہیں۔ یہ سب درست ہے لیکن جب اصلی تیاگ کا موقع آیا۔ اس وقت تم سے دھیرج نہیں رکھا گیا تمہارے دل سے نیکی کا بدلہ دینے کی خواہش ختم نہیں ہوئی۔

راجکمار سرنگوں اور شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اور بولا۔ ہے بھگوان مجھے چاروں طرف اندھیری اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ میرے دل کے اندھیرے کے سامنے رات کے اندھیرے کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔

بدھ دیو بولے تیسری دفعہ تم محبت اور رحم میں کامیاب نہیں ہوئے

تمہاری نندا نامی عورت نے اخلاق کے برخلاف کام کیا۔ اس لئے تم نے اسے راج محل سے نکال دیا۔ اس کی جہالت اور جوانی پر تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ اس پر نہیں دیا نہ آئی۔

راج کمار نے پوچھا۔ ہے بھگوان آپ ہی فرمایئے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بچانا کیا میرا دھرم نہیں ہے۔ قصوروار اور بدچلن عورتوں کے پاس رہنا کیا مناسب ہے۔ اس کے قصور کی سزا دینے میں اگر میں نے ذرا چشم پوشی کی ہوتی تو کیا مجھ پر یہ عیب نہ لگایا جاتا کہ اسے ملک کے رسم و رواج کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔

بدھ دیو نے فرمایا۔ اے فیاض راج کمار تم سے مجھے بار بار وہی بات کہنی پڑتی ہے۔ دنیا کے پھندے میں پھنسے ہوئے نیک اشخاص اپنی عزت یا اپنے خاندان کی آبرو رکھنے کے لئے خواہ کتنی ہی کوشش کریں۔ وہ انصاف کریں سزا دیویں۔ یا نکال دیویں لیکن سادھو لوگوں کو ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ اصلی حقیقت کو ہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کے باعث ان سے ہر ایک جاندار کو معافی ملتی ہے۔ قصور کو معلوم کرنے کی نسبت کہ قصور کیوں ہوا ہے۔ اس کی جستجو میں وہ زیادہ محنت کرتے ہیں۔ سمندر کی لہروں کی گنتی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کے دل میں رہنے والی دیا کو سمندر کی لہروں کا شمار کرنا مشکل ہے۔ برے کاموں سے دور رہنا یہ کوئی بڑا بھاری وصف نہیں ہے۔ سادھو لوگ اسے کوئی بڑپن کا کام نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال سے کبھی کبھی یہ بیرونی پاکیزگی ہی

عروج کے راستہ میں خلل ڈالنے والی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر پاکیزگی کے ساتھ اصلی ماہیت کا علم نہ ہو یعنی باطن پاک نہ ہو تو بے رحمی اور غرور پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتے اور آخر میں اگر دیکھو تو پاکیزگی کی بجائے صرف اس کا سایہ ہی رہ جاتا ہے۔ ہے ولی عہد تم نے اپنے سفر میں کبھی سورج غروب ہونے کے وقت ہمالہ پہاڑ کی چوٹی کی طرف نظر ڈالی ہے۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر صرف خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ وہاں دل اور آنکھوں کو خوش کرنے والی سبز ہی رنگ کی کرنیں کبھی دیکھی ہیں۔ بیرونی پاکیزگی اسی قسم کی ہے۔

راجکمار کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بدھ دیو کو نمسکار کر کے بھرائی آواز سے کہا ہے پربھو اپنے پاس سے مجھے دور نہ کرو۔ آپ کا چیلا بننے کے لئے مجھے ایک دفعہ پھر کوشش کرنے دو۔ آپ کے چیلا بننے کی قابلیت کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ اب میں نے بخوبی سمجھ لیا ہے

بدھ دیو نے کہا۔ اچھا جاؤ۔ تمہاری درخواست منظور ہے۔ راجکمار اپنے ہمراہیوں کو لے کر اسی وقت وہاں سے چلا گیا

راجکمار جیتر سنگھ نے اپنے راج میں پہنچ کر اپنے والد کی وفات کا حال سُنا۔ راج کے سارے کاروبار کا بوجھ اس کے سر پر آ پڑا۔ انصاف سے رعایا کی پرورش کرنے کے باعث تھوڑے ہی دنوں میں وہ منصف اور رعایا دوست راجہ کہلانے لگا۔

اس سے پہلے اپنے دوست کے لئے اور اس سے دوستی کرنے کی

خواہش کرنے والے مذکورہ بالا اجنبی شخص کے لئے پاس پاس دو محل
بنوا دیئے اور اپنی نکالی ہوئی عورت کو بھی بلا کر پھر راج محل میں داخل کر
لیا۔ اس سے راجہ کی بڑی مذمت ہونے لگی اس کے والد کے وقت
کے جو بوڑھے ملازم تھے وہ ناراض ہو گئے۔ گھر گھر انہی باتوں کی چرچا
ہونے لگی۔ اس کی مناسب اصلاحوں میں لوگوں کو یہ خرابی معلوم ہونے
لگی کہ یہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا ہے۔

لیکن راجہ اپنی بات پر قائم رہا۔ اسے پھولوں کی سیج اور کانٹوں کا بستر
یکساں معلوم ہونے لگا۔ سونا اور کانچ۔ محل اور شمشان۔ دولت مند
اور کنگال۔ جینا اور مرنا یہ سب اس کو یکساں معلوم ہوتے تھے۔ اس نے
لوگوں کی مذمت اور تعریف کی طرف آنکھ اٹھا کر نگاہ تک نہ کی۔ وہ اپنے
فرض کے راستہ پر برابر چلتا رہا۔

راجہ کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی مذکورہ بالا باتوں
سے ناراض ہو کر دشمن بن گیا۔ اس نے راجہ کے خلاف ایک بڑی بھاری
سازش کی جس کی غرض راج کو الٹ دینے کی تھی۔

ایک دن راجہ جیتر سنگھ کو کسی نے آکر خبر دی کہ تمہارے قتل کرنے
کی خفیہ کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن اس سے راجہ ذرا بھی نہ ڈرا۔ اسے
اپنی حفاظت کی ذرا بھی فکر نہ ہوئی۔ اپنی جان جانے کے خوف سے وہ
نہیں گھبرایا۔ اس نے ایک دن اپنی خلوت گاہ میں دیکھا کہ ایک ناواقف
شخص نے میرا کام تمام کرنے کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔ وہ تلوار اٹھا کی

گردن پر پڑی ہی چاہتی تھی کہ اس کے چند دوستوں نے وہاں پہنچ کر اسے درمیان میں ہی روک دیا۔ اور مارنے والے کو اسی وقت قید کر دیا۔ مارنے والا آزاد نامی ایک کھشتری تھا۔ راجہ نے پوچھا ہے آزاد تم کس باعث میرا خون کرنا چاہتے تھے۔

اس نے جواب دیا۔ اس لئے کہ راج کا ستیاناس ہونے والا ہے تیرا برتاؤ یہاں کے پہلے راجاؤں کے بالکل خلاف ہے۔ تو جتنی اصلاحیں کرتا ہے وہ سب انجام میں راج کا ناس کرنے والی ہیں۔

جیتر سنگھ نے خیال کیا کہ یہ مجرم جاہل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اپنے ملازموں سے کہا۔ اگرچہ اس شخص نے میرے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی نیت اچھی ہے۔ اس لئے اس کو آزاد کر دو اور میرے پاس اسے اکیلا چھوڑ کر تم سب باہر چلے جاؤ۔

ملازم متعجب ہو کر باہر چلے گئے۔ راجہ کی جرأت کے بارے میں انہیں اس وقت کچھ ڈر ہوا۔ آزاد لاپرواہی سے راجہ کی طرف دیکھنے لگا لیکن راجہ نے اس کی صورت پر کچھ بھی دھیان نہ دیا۔ آزاد نے دیکھا کہ راجہ کے چہرہ پر دیا ملامت یا فتح کا سایہ بھی نہیں ہے۔ وہ بھگوان بدھ دیو کے اس اپدیش کے مطابق کہ "نیک لوگ قصور کو معلوم کرنے کی نسبت کہ قصور کیوں ہوا ہے اس بات کی تحقیق کرنے میں زیادہ محنت اٹھاتے ہیں" پہلے افعال کے معائنہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ان افعال کا وچار کر رہا تھا جن کے باعث آزاد نے اس کے مارنے کی کوشش کی تھی اور وہ خود مرتا مرتا بچ

گیا تھا یکایک اس کی صورت پلٹ گئی۔ وہ اپنی انتر آتما سے اس طرح دیکھنے لگا۔ گویا گُرو دیو نے ہی اس کے ہردے کے کواڑ کھول دیئے ہیں۔ چیز کی ماہیت اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ اس کھشتری کے سابقہ افعال اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔

اسے معلوم ہوا کہ بجلی کی مانند آزاد کا بھاری جسم لمحے لمحے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ جہالت سے اور اس کے جمع کئے ہوئے افعال قبیحہ سے جانداروں کو جو تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ ان کا اصلی نظارہ اس وقت اسے دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی دیر میں جیسے کوئی نیند سے جاگ اٹھتا ہے۔ اسی طرح راجہ نے بیدار ہو کر اس کھشتری کمار سے کہا۔ بھائی تمہاری بابت میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ تم میرے رشتہ دار ہو۔ میرے اور تمہارے سروپ میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ہم تم دونوں ہی ایک راستہ کے مسافر ہیں۔ آؤ ہم تم دل سے ملیں اور اس راستہ کو جلدی طے کرنے کی کوشش کریں۔ بہت وقت گزر گیا۔ یہ دیکھ کر راجہ کے نجاوُں کو خوف ہوا انہوں نے اندر جا کر دیکھا تو آزاد جیتر سنگھ کے کندھے پر سر رکھے ہوئے رو رہا ہے۔ اور جیتر سنگھ ایک عجیب روحانی جلال سے چمک رہا ہے۔

بھگوان بدھ دیو مذکورہ بالا پائین باغ میں ہی براجمان ہیں۔ صبح کا وقت ہے۔ سورج آہستہ آہستہ نکل رہا ہے۔ کسی آدمی کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ بھگوان بدھ دیو نے آنکھیں کھولیں۔ راجہ جیتر سنگھ نمسکار کر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اس وقت راجہ کے ساتھ کوئی بھی آدمی نہ تھا۔ اس نے بھکشو کا بھیس دھارن کر رکھا تھا۔ اس کی صورت پر ایک عجیب شانتی برس رہی تھی۔ بدھ بھگوان نے اُسے آشیرباد دی۔ اور کہا بیٹا تم امتحان میں پاس ہو چکے ہو، اب خوشی کے ساتھ دیکھشا لے کر... بے شمار دنیاوی رنجوں میں ڈوبے ہوئے جانداروں کا بھلا کرو۔

اس کے بعد بُدھ دیو نے اِسے منتر دیا۔ اس سمے خوشبودار اور آہستہ ہوا چل رہی تھی۔ چاروں طرف شانتی ہی شانتی پھیل رہی تھی۔ اور صبح کے وقت کی خوب صورتی غیر معمولی معلوم ہوتی تھی۔

باغبان

چند روز سے مہاراجہ بنارس کے حرم سرائے کے باغ میں ایک مالی آیا ہوا ہے۔ وہ اپنا نام بسنت بتلاتا ہے۔ وہ خوبصورتی اور اوصاف میں موسموں کے راجہ بسنت سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

ایک روز موسم بسنت کے شروع میں جب ایک ناواقف نوجوان مہاراجہ کے دربار میں ملازمت کی خواہش سے حاضر ہوا اس کے دیکھنے سے تمام درباریوں کا دل محبت کے جوش سے بھر آیا۔ عمر رسیدہ وزیر کا عمیق دل محبت سے بے قرار ہوگیا۔ مہاراجہ صاحب خود بدولت بنظرِ غور دیکھنے لگے۔ اور پردہ کے اندر جو بیگمات موجود تھیں۔ اس نوجوان کو دیکھنے سے اُن کی چنچل آنکھیں ششدر رہ گئیں۔

مہاراجہ نے اسے بڑی عزت سے سبھا میں بٹھا کر دریافت کیا۔ اے

نوجوان تم کون ہو۔ اور کس جگہ کے باشندے ہو۔ اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارا جسم پھول کی مانند نازک اور خوبصورت ہے۔ تم کیا کام کرنا پسند کرتے ہو۔ تمہیں کسی کام کے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف روزانہ دربار میں حاضری دے جایا کرو۔

بسنت نے آداب شاہانہ بجا کر نہایت تحمّل اور ادب سے عرض کی۔ مہاراج جس شخص کو کوئی کام نہ ہو۔ اُس کے دُکھ کی کیا حد ہو سکتی ہے۔ براہ مہربانی مجھے اس تکلیف سے نجات دیں۔ نیازمند کو حضور والا اپنی ہی خدمت کے لئے تعیّن فرما دیں۔ اور جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا جناب کی خدمت کے بجا لانے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کروں گا۔

مہاراجہ نے خوش ہو کر فرمایا۔ اچھّا اے نوجوان بتلاؤ۔ تمہیں کیا کام پسند ہے۔ وزیر۔ کمانڈر انچیف اور ملک الشعراء وغیرہ جس کسی کو تمہاری امداد ملے گی۔ وہ تم سے خوش ہو گا۔ بتلاؤ۔ تمہیں کونسا کام پسند ہے۔

بسنت نے دست بستہ عرض کی حضور یہ میری طاقت سے باہر ہے میں کسی اہم کام کی ذمہ داری کو انجام نہیں دے سکوں گا۔ میری خواہش ہے کہ میں حضور کے شاہی باغ کا مالی بنوں۔ ہر روز نئے پھولوں کی مالاؤں سے مہاراج کی پوجا کروں اور صبح شام سُریلی آواز سے مہاراج کے اوصاف بیان کیا کروں۔ اور میں کچھ نہیں چاہتا ہوں۔

تمام حاضرین نے یہ خیال کیا کہ یہ بہت خوبصورت شخص ہے۔ لیکن دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ مہاراجہ نے مہربانی فرماکر اس دیوانہ کی درخواست کو منظور کیا۔ وہ اسی دن سے مہاراجہ کے خاص باغیچہ کا مالی بن گیا۔

باغ کے ایک گوشہ میں نسبت کی جھونپڑی تھی۔ وہ چاروں طرف بیلوں سے گھری ہوئی اور پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے اندر پھولوں کا فرش ہو رہا تھا۔ باغ میں خوبصورت درخت سرو قد خاموشی سے کھڑے ہوئے خوشنما پھولوں سے جڑے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے۔ گویا کوئل کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔ بسنت صبح و شام بین کے ذریعہ جو مؤثر راگ الاپتا تھا۔ اس کی شیریں آواز سے ہوا بھی فریفتہ ہو جاتی تھی۔ اور سارا راج محل خوشی کے مارے گونج اٹھتا تھا۔ صبح و شام جو طرح طرح کے پھولوں کے خوشنما ہار بناتا تھا۔ انہیں دیکھ کر ہر شخص کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اور محبت جوش مارنے لگتی تھی۔

صبح و شام مالی سے نذر و نیاز لینے کے لئے جب راج کماریاں گلاب کی کیاریوں کے نزدیک بجلی کی روشنوں کے نیچے اور سنگ مرمر کے اوپر اپنے نازک اور خوب صورت پاؤں رکھتی ہوئی مالی کی جھونپڑی کے پاس اکٹھی ہوتی تھیں۔ اس وقت سارا باغ کھل اٹھتا تھا۔ درختوں کے پھول ہنستے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور کوئل اور پپیہے گانے لگتے تھے۔

اس وقت بسنت سر سبز پتوں کے دونوں میں شبنم سے تر و تازہ پھولوں کے ہار بھینٹ کر کے اپنی خدمت انجام دیتا تھا۔

بسنت کے بنائے ہوئے ہاروں میں طرح طرح کے پھول ہوتے تھے۔ وہ کماری اندرا کے لئے اندی ور (ن یعنی کملوں کی مالا کماری شکنتلا کے لئے کھلے ہوئے گلاب کے پھولوں کی مالا اور کماری اننت ما کے لئے خوشنما چنبیلی کی مالا پیش کرتا تھا۔

ان سب کے بعد ایک اور نوجوان لڑکی آتی تھی۔ وہ سیاہ فام اور بدصورت تھی۔ اور اسی وجہ سے اس کا نام بھی جمنا تھا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ جمنا کا جل کالا ہوتا ہے۔

جیسے کہ چاند میں ایک سیاہ داغ نظر آتا ہے۔ ویسے ہی ان خوبصورت راج کماریوں کے درمیان جمنا تھی۔ چاند میں سیاہ داغ ہوتے ہوئے بھی وہ داغ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جمنا کی بدصورتی بھی ان خوبصورت راج کماریوں کے درمیان بری معلوم نہیں ہوتی تھی۔ جمنا اپنی بدصورتی کو جانتی تھی۔ اس لئے ململ کی گلابی ساڑھی کے پلے سے وہ اپنے آپ کو چھپانا چاہتی تھی اور تمام کی نظر سے بچنے کے لئے وہ سب سے پیچھے رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پلکوں سے حیا ظاہر ہوتی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتی تھی۔ اس کی آواز شیریں اور دل ڈرپوک تھا۔ وہ بدصورت تھی۔ اس لئے شرم اس کی دامنگیر رہتی تھی خدا تعالےٰ نے اس کے

ہر ایک عضو کو بدنما بنایا تھا۔ جس کو وہ چھپا نہیں سکتی تھی۔ باقی تمام راج کماریاں اپنی خوبصورتی کے نشہ میں مست ہو کر ہنستی، گاتی اور ناچتی تھیں۔ ان کا برتاؤ آزادانہ اور رفتار بے باکانہ تھی۔ وہ بسنت کے روبرو ہنستی تھیں۔ باتیں کرتی تھیں۔ بار بار ہنستی تھیں۔ پھول اچھالتی تھیں۔ اور آپس میں الجھتی تھیں۔ بسنت خوش ہو کر ان کے چرنوں میں بہت سے پھول ڈال دیتا تھا۔ بین بجاتا تھا۔ اور دلکش نظم میں ان کی خوب صورتی کی تعریف کرتا تھا۔ اور جمنا اس وقت خوف اور شرم کے باعث ایک طرف خاموش کھڑی ہو کر اپنے آپ کو چھپانا چاہتی تھی۔ کوئی اس کی طرف بھول کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

اسے اس قدر شرم تھی۔ اور اس کی اتنی بے عزتی ہوتی تھی۔ تاہم وہ اس جگہ آتی تھی۔ بسنت نے اپنے پھولوں کی مالاؤں میں۔ راگوں میں۔ بین میں۔ باتوں میں، ہنسی مذاق میں رنگ و روپ اور جوبن میں ملا کر جو عجیب و غریب راگنی اس کے چاروں طرف پھیلا دی تھی۔ اس کے غیر مرئی قرب نے اس بدشکل کماری کی ضمیر میں ایک ایسا کھلنے والا اثر بھر دیا تھا کہ اس کے جوش میں باوجود اس قدر مذمت اور حقارت کے کسی قسم کی کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ دیگر نوجوان راج کماریاں تو ہنسنے گانے اور کھیلنے کے لئے آتی تھیں۔ لیکن جمنا صرف اپنی پیاس بجھانے کے لئے آتی تھی۔ تمام راج کماریاں اس لئے آتی تھیں کہ بسنت ہماری سیوا کرے، تعریف کرے اور

ہار پہنائے۔ لیکن جمنا اپنی سیاہ جل بھری اور صاف آنکھوں کی بے قرار نظر سے بھگتی نے بس ہو کر بسنت کی خوبصورتی کی پوجا کرنے کے لئے آتی تھی۔

اگرچہ اس بدصورت شرمیلی اور خاموش لڑکی پر بسنت کو نظر ڈالنے کی فرصت نہ تھی۔ پھر بھی وہ بسنت کی نظر میں اس لئے پڑ گئی تھی کہ وہ اور سب راج کماریوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ یعنے اس کا بدصورت ہونا ہی بسنت کے نظر ڈالنے کا باعث تھا۔ ورنہ بسنت ایسی خوب صورت شناس نگاہوں کو اس بدصورت لڑکی پر کیوں ڈالتا۔ اس وقت وہ جوانی کے نشہ میں چور ہو رہا تھا۔

اس بدصورت راج کماری کو وہ ان خوبصورت راج کماریوں میں سے کس طرح علیحدہ کر سکتا تھا۔ اس لئے بسنت پہلے دوسری راج کماریوں کے لئے مالا تیار کرتا تھا۔ اور ان سے بچے ہوئے باسی نکمے پھولوں کی ایک مالا صرف تہذیب کے خیال سے بنا رکھتا تھا۔ اور وہ مالا جمنا کو ایسی حقارت کے ساتھ دیتا تھا۔ جیسے کہ بادشاہوں کے دروازے پر گدا کو خیرات دی جاتی ہے۔ لیکن جمنا اس مالا کو دیوتا کا پرشاد سمجھ کر بڑی شردھا کے ساتھ اپنے گلے میں پہن لیتی تھی۔ جس دن کماری اندرا ایک عجیب طرح گردن کو جھکا کر ناز نخرے سے مسکراتی تھی کماری شکلا جاتے جاتے ایک دو دفعہ مہربانی کی نگاہ سے پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تھی۔ اور کماری آنندنا دل خوش کن قہقہہ لگا جاتی تھی۔ اس دن بسنت

جمنا کے لئے بھی باسی اور سیاہ رنگ کے اُپر جنبا نامی پھولوں کی ایک مالا بنا دیتا تھا۔ بسنت کا یہ غیر معمولی پرشاد لے کر جمنا کے دل میں اس قدر خوشی بھر جاتی تھی۔ اور وہ اتنی شکر گزار ہوتی تھی کہ اس وقت اسے اپنی شرم و حیا کا بھی خیال نہیں رہتا تھا۔

بسنت کا باغیچہ اس کے لگائے ہوئے اور خود رو پھولوں سے آراستہ رہتا تھا۔ چاندنی کی روشنی اور خوب صورتی کی چمک دمک سے سجا رہتا تھا۔ پرندوں کی شیریں آواز اور نوجوان عورتوں کی مسکراہٹ اور ہنسی مذاق سے ہر وقت گونجا ہوا رہتا تھا۔ فواروں کی متواتر دھاروں اور دلوں کی لگاتار محبت سے سینچا جاتا تھا۔ اور لعل و جواہرات کی روشنی سے اور بڑی بڑی آنکھوں کے غمزے سے روشن رہتا تھا دن کے بعد دن، رات کے بعد رات، صبح کے بعد شام اور شام کے بعد صبح اس طرح آنند میں وقت بسر ہوتا چلا جاتا تھا۔ اس باغ میں راج کماریوں کا گروہ آنند میں مگن اور شادی ہونے کی خوشی میں مست رہتا تھا۔ بسنت کسنبہ کے پھولوں کے شوخ رنگ سے ان کی اوڑھنیاں رنگ دیتا تھا۔ ڈھک منڈلی کے پھولوں کو مسل کر ان کے پاؤں رنگ دیتا تھا۔ حنا کے پتوں کے رس سے ان کے ہاتھ رنگ دیتا تھا۔ اور شیریں تمسخر اور کلام اور خواہش والی نگاہ سے ان کے دلوں کو لبھانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان خوبصورت راج کماریوں کا دل اس سے فریفتہ ہوتا تھا یا نہیں اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان

راج کماریوں کے افیون کے پھولوں کی مانند سُرخ رخسارے اور کسُنبہ رنگ کی پوشاک اور مہندی سے رنگے ہوئے پاؤں اپنی تمام سُرخی کو اکٹھا کر کے بسنت کے نازک دل کو خون کے رنگ سے رنگ دیتے تھے۔ نوجوان کماریاں بسنت سے جس قدر واقفیت بڑھاتی تھیں۔ بسنت اپنے دل میں اسی قدر خلا معلوم کرتا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس ساری خلا کو بھر کر وہ کسی ایک کو اپنی زندگی کے مندر میں بلانے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب شام کے وقت ہر ایک درخت پر پھولوں کے چندوے تن رہے تھے۔ جنوبی ہوا جدائی سے بے ہوش ہوئے انسانوں کے سانس کی مانند رہ رہ کر پھولوں کے بن میں لرزہ پیدا کرتی تھی پھولوں کی خوشبو سے مست ہو کر کوئل اور پپیہا باتیں کرتے تھے اور ہزاروں چراغوں کی روشنی کے درمیان فواروں کا جل ہیرے کی مالاؤں کی طرح پڑتا تھا۔ اس وقت بسنت کے محبت بھرے راگ بند کر کے راج کماری اندرا ہو بہو لکشمی کی مانند اس کی جھونپڑی کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی بسنت اسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھولوں سے بھرے ہوئے ایک دونے کو اس کے چرنوں میں ڈال کر بولا۔ اندرا تم باہر کے پھولوں کو تو ہمیشہ لے جاتی ہو۔ میرے دل کا کھلا تازہ پھول کیا تمہارے قدموں میں جگہ نہیں پائے گا۔ اور کیا یہ پھولوں کا بن شادی کی خوشی سے اور زیادہ خوب صورتی سے نہیں کھلے گا؟

کماری اندرا تیوری چڑھا کر پھولوں کو حقارت کی نظر سے پاؤں سے روند کر بجلی کی مانند کڑک کر بولی۔ ارے نیچ مالی کی اتنی بھاری جرأت کیوں ہے۔ مہربانی کو تو بیاہ سمجھتا ہے۔ تجھے ایک راج کماری کو اپنی جھونپڑی میں رکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا ہے کہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے کرناٹک دیس جیسے مہاراجہ خواستگار ہوئے ہیں۔ تیری یہ سب جرأت کل اس وقت خاک میں مل جائے گی۔ جب راجہ کے حکم سے تو سولی پر چڑھایا جائے گا۔

بسنت کے دل میں اس بے عزتی سے جو تکلیف پیدا ہوئی۔ وہ سولی کی سزا سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جس اندرا کے قدموں میں وہ اپنے دل کے عمدہ سے عمدہ اور نہایت قیمتی پھول یکے بعد دیگرے چڑھا کر خالی ہو گیا تھا۔ آج اسی اندرا نے اسے حقیر سے حقیر سمجھ کر پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ دنیا میں کیا محبت اور وفاداری کا عوض اسی طرح دیا جاتا ہے۔

بسنت نے اندرا کے قدموں میں پڑ کر کہا۔ سولی چڑھانا ہو تو چڑھوا دینا۔ میں منع نہیں کرتا۔ لیکن اے راج کنیا۔ ذرا سوچو تو سہی ظاہر اگرچہ میں غریب معلوم ہوتا ہوں۔ لیکن باطن میں غریب نہیں ہوں۔ جو اقبال میں نے تمہارے قدموں میں نثار کر دیا ہے۔ اسے تم کسی مہاراج کے بھنڈار میں تلاش کرنے سے بھی نہیں پاؤ گی۔

غریب کو سب طرح غریب کر کے مت مارو۔

اندرا ہنسی اور اس کی اس ہنسی نے بسنت کے دل کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک گویا آرے سے چیر دیا۔

بسنت نے عاجزی سے کہا۔ میری اتنے عرصہ کی خدمات کے عوض میں ایک آخری درخواست اگر قبول کر لیں۔ تو بہتر ہے۔ کل صبح سے پہلے تم یہ بات کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ میں ایک مرتبہ کماری شنکلا اور اننداتا سے ساتھ بھی اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔

اندرا نے غرور سے کہا۔ اچھا تمہاری درخواست منظور ہے میں خود ہی انہیں بلا دیتی ہوں لیکن میں یہ بھی جتلا دیتی ہوں کہ یہ محض تمہاری حماقت ہے رہبر دوسر رکھو۔ کوئی بھی راج کماری مالی سے شادی نہ کرائے گی۔ اور تو کیا سب باہ فام راج کماری جمنا بھی مالی سے شادی کرنا منظور نہیں کرے گی۔ مالی خواہ کتنا ہی خوب صورت اور دلکش کیوں نہ ہو۔ راج کماریاں اس سے شادی نہیں کرا سکتیں۔

جمنا نے تعجب سے کہا۔ بسنت بلاتا ہے! مجھے؟

خوشی سے۔ شرم سے۔ امید سے۔ شبہ سے جمنا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی بہنوں کی طرف نہ دیکھ سکی۔ اس نے اس کی سخت ہنسی پر خیال نہ کیا۔ وہ جاتری کے مانند بڑی خوشی سے اور نئی دولہن کی طرح لرزتے ہوئے دل سے شرم و حیا سے آہستہ آہستہ جا کر بسنت کے سامنے خاموش پیشانی جھکائے جا کھڑی ہوئی۔ بسنت اس وقت

زمین پر پڑا ہوا رو رہا تھا۔ اس نے جمنا کی طرف نگاہ تک نہ کی
بسنت کو روتے ہوئے دیکھ کر جمنا کا جگر پاش پاش ہونے لگا۔
وہ نہیں سمجھ سکی کہ میری بے رحم بہنیں بسنت کو کس مصیبت میں
مبتلا کر گئی ہیں۔ جمنا اپنے اس مصیبت زدہ رشتہ دار کی طرف آنسو
بھری اور مترحم نظر سے دیکھتے دیکھتے کانپتے ہوئے گلے سے تسلی دینے
کے لئے بولی۔ ہے بسنت!
بسنت آہ سرد بھر کر زور سے بولا۔ دور ہو۔ جا۔ جلاد کو بلا لا۔ تاکہ
وہ مجھے ابھی سولی پر چڑھا دے۔
شرمیلی۔ دکھی اور کم گو۔ جمنا آبدیدہ ہو کر آہستہ آہستہ وہاں سے
چلی گئی۔ اسے بسنت کی تکلیف بسنت سے بھی دوچند محسوس ہونے
لگی۔ اگر وہ اپنی ساری طاقت سے تمام شانتی سے قسمت سے اور
راحت سے ۔بنا کو چھان کر بسنت کو تسلی دے سکتی تو دینے کو تیار تھی۔
لیکن اس کی کہیں عزت نہ تھی۔ وہ بدصورت تھی۔ اپنی ناقابلیت سے
آپ ہی دکھی ہونے لگی۔
دیگر خوب صورت راج کماریوں نے ہنس کر پوچھا۔ کیوں ری جمنا!
مالی نے تجھے کیا کہا؟
اس بات کا جواب وہ بدصورت لڑکی کیا دے سکتی تھی۔ اس نے
سرنگوں ہو کر صرف یہ کہا کہ کچھ نہیں۔
خوبصورت راج کماریاں اپنے قہقہوں سے درختوں کے جانور دل

کوڈراتی ہوئی بولیں۔ واہ رے شوقین مالی تجھے سیاہ فام جمنا پسند نہ آئی ہے جمنا! اس بات کا خیال کرنے سے بھی ہم کو شرم آتی ہے کہ تو ہماری بہن ہے۔ اور معمولی مالی بھی تجھ سے نفرت کرتا ہے۔ ہمارے پیچھے پیچھے سائے کی طرح لگے رہنے سے تجھے شرم نہیں آتی؟

اس بے عزتی سے جمنا کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ ایسا سلوک تو اس کے ساتھ ہمیشہ ہی ہوا کرتا تھا۔ یہ اُس کا زیور تھا۔ لیکن اس کی بہنیں جو بسنت کے دُکھ میں ہنستی تھیں۔ اور اس کو تکلیف دینا چاہتی تھیں۔ اس سے جمنا کے دل میں ایسی تکلیف ہونے لگی۔ گویا ہزار کانٹے اس کے جسم میں چبھ گئے۔ وہ اُن کی اس بے رحم خوشی کو دیکھ کر زندہ رہنے کی نسبت مر جانا بہتر سمجھتی تھی۔ جمنا اگر اپنے خونی آنسوؤں سے بھیگے ہوئے دل سے ڈھک کر بسنت کو اس سخت بے رحمی سے بچا سکتی تو بچا لیتی لیکن کیا کرے بے چاری بے بس تھی۔

اس پھولوں کے بن کی آہستہ آہستہ ہوا سے بھی جمنا کے دل کے تالاب میں آج جو اونچی اونچی لہریں اُٹھتی تھیں۔ وہ بڑی پُر درد تھیں۔ آج اس باغیچہ کے زندہ دل مالی کی تکلیف دیکھ کر پھولوں کا کھلنا۔ پرندوں کا چہچہانا۔ بھوروں کا گونجنا۔ چاندنی کا چٹکنا۔ اور ہوا کا پتہ پتہ کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنا بُرا معلوم ہوتا تھا۔ جمنا باغیچہ کی اس بے رحم اور بے حیا حرکت کو اگر اندھیرے کا سیاہ پردہ ڈال کر ڈھک سکتی تو ضرور ڈھک دیتی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام باغیچہ میری بہنوں کے جال میں

شامل ہو کر بسنت کی تکلیف سے خوش ہو رہا ہے۔ آج جمنا کی شرم و حیا
اس کے مصیبت زدہ دل میں تیز چھری کی مانند لگتی تھی۔

دوسرے دن صبح کے وقت راج کماریوں نے راجہ کے پاس جاکر
بسنت کی واردات کا حال بیان کیا۔ اور عرض کی کہ اس بے تہذیب مالی
کو سولی پر چڑھانا چاہیئے۔ راج کماریوں نے بہت عرصہ سے کسی انسان
کو پھانسی پاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

راجہ کی اجازت سے بسنت راج سبھا میں قید کر کے لایا گیا۔
اس نے بے چون و چرا اپنا قصور تسلیم کر لیا۔ اگر وہ جھوٹ بول کر بھی اپنی خطا
کو نہ مانتا تو راج سبھا خوش ہوتی۔ لیکن نہیں بسنت اپنی اس ناامیدی
کی زندگی سے مرنا بہتر سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے کسی طرح بھی اپنی خطا کو
نہ چھپایا۔ بسنت کو دیکھ کر سخت زرہ بکتر پہنے ہوئے پہرہ دار کی آنکھوں
میں بھی آنسو بھر آئے۔ واہ کیسا نازک اندام ہے۔ کیا یہ نازک اور خوبصورت
بسنت سولی پر چڑھایا جائے گا۔

راجہ نے راج کماریوں کو تسلی دے کر کہا ہے راجکماریو! یہ تو پاگل ہے
اس کو اگر تمہاری خواہش ہو تو راج سے نکال دیا جاوے۔ بس اتنی سزا
سے معاملہ طے ہو جائے گا!

لیکن راج کماریاں اپنے قول سے باز نہ آئیں۔ وہ تو نوکر کو سولی پر چڑھتے
ہوئے دیکھ کر ہی خوش ہوں گی۔ اور اس کے دل کو چیر کر اپنے پاؤں کو رنگے
بغیر نہ رہیں گی۔

آخر ناچار حکم دیا کہ بسنت کو عمر قید کی سزا دی جائے۔

راجکماریوں نے کہا اچھا اگر قید کا ہی حکم ہے۔ یہ تو حرم سرا کے قید خانہ میں رکھا جاوے۔ وہاں رکھنے سے اس کے باعث ہمارا کچھ وقت خوشی میں گزرے گا۔

راجہ نے کہا ایسا ہی ہوگا۔

حرم سرا کی پُر رحم عورتوں کو جن پہ غصہ آتا تھا۔ ان بدنصیب لوگوں کے لئے حرم سرا میں ایک تاریک قید خانہ بنایا گیا تھا۔ یہ قید خانہ لوہے کے کواڑوں کی مانند دانت ملا کر جیسے اپنا لقمہ بناتا تھا اسے زندہ باہر نہ نکالتا تھا۔ ان کواڑوں میں کہیں ذرا سی بھی درز نہ تھی جس سے باہر کی تھوڑی سی روشنی بھی اندر آ جائے۔ صرف تھوڑی سی ہوا آنے کے لئے دیوار اور چھت کے جوڑ میں دو چار چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے اور کھانا پہنچانے کے لئے ایک چھوٹا سا طاق تھا کہ بہت جلدی موت واقع نہ ہو۔ اس لئے یہ تھوڑی سی آسانی مصیبت زدہ شخص کو آرام دینے کی غرض سے نہیں تھی۔ پُر رحم عورتوں کا حکم تھا کہ روشنی۔ ہوا اور خوراک جس قدر ممکن ہو ان سب دروازوں سے بلا روک پہنچائی جاوے۔ لیکن اجازت ہونے پر بھی مذکورہ بالا دروازوں سے روشنی اور ہوا پورے طور پر نہیں جا سکتی تھی۔ کیونکہ جس جگہ میں سوراخ تھے۔ اس کے آگے ایک اور پتھر کی بلند دیوار ایستادہ تھی اور جو بھوجن پہنچانے کا دروازہ تھا اس میں ایک معمولی کٹورے سے بڑی کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ راہن کے

اندر جو بد قسمت شخص پہنچ جاتا تھا۔ اسے صبر اور استقلال کے ساتھ مرنے کی انتظار کے سوا اور کوئی شانتی کا علاج نہ تھا۔ خوراک پہنچانے کا دروازہ اس قدر بلندی پر تھا کہ اس میں سے باہر کا آدمی اندر اور اندر کا آدمی باہر نہ دیکھ سکتا تھا۔ صرف ہاتھ ڈال کر خوراک دی اور لی جا سکتی تھی بھوجن کا برتن خالی کر کے طاق کے اوپر رکھ دیا جاتا تھا اور جس دن برتن خالی نہ ہوتا تھا۔ اس روز یہ سمجھا جاتا تھا کہ قیدی تکلیف میں ہے۔ اور سات یوم برابر اسی طرح برتن خالی نہ پانے سے یقین کر لیا جاتا تھا۔ کہ قیدی اجل کا شکار ہو گیا۔

بسنت اسی خوفناک قید خانے میں رکھا گیا۔ اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کی محبت کی جگہ تمام خوب صورت چہرے۔ اس کے چاند۔ سورج۔ روشنی آسمان۔ پھول۔ ہوا وغیرہ تمام عزیز اشیاء ہمیشہ کے لئے لوہے کے کواڑوں کی آڑ میں غائب ہو گئیں۔ باہر کی خوشی کی آواز ضرور اس کے کانوں تک پہنچتی تھی لیکن اس کی طرف اس کا دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ وہ اپنی مایوس محبت کے شوق میں اس طرح مستغرق رہتا تھا کہ اس کا مذکورہ بالا خوشی کے شور و غل کی طرف دھیان ہی نہ جاتا تھا۔

خوبصورت راجکماریاں قید خانے کے قریب آ کر طاق کے پاس ہنس ہنس کر کہتی تھیں۔ کیوں جی خاوند مہاشے۔ سسرال میں آج کیسا آنند آ رہا ہے۔ اے شوقین مالی ہم تمہارے گلے میں بر مالا ڈالنے آئی ہیں

دا سے منظور کرو۔ اس کے بعد وہ کانٹوں کی مالا بسنت کے آگے پھینک کر خوب کھلکھلا کر ہنستی تھیں۔ ان کی وہ کانٹوں سے بھی تیز اور دردانگیز ہنسی ان کے نیچے رہنے والی جمنا کے دل میں سُول کی مانند چبھتی تھی۔

لیکن یہ راج کماریوں کا بُرا سلوک بسنت کو زیادہ تکلیف نہ دے سکتا تھا کیونکہ ان کا پہلا سلوک ہی ایسا دل شکن... تھا کہ اس کے بعد کی اس نئی تکلیف کو محسوس نہ کرتا تھا۔

بسنت بہت کچھ التجا کر کے قید خانے میں اپنی بین بھی لے آیا تھا۔ اندھیرے میں بیٹھ کر جب وہ اپنی واحد بین کو کلیجہ سے لگا کر بجاتا تھا۔ اور اس کے ہر ایک سُر سے اپنے دل کی تکلیف ظاہر کرتا تھا۔ اُس وقت حریم سرا کی تمام عورتیں رنج کے سمندر میں غرق ہو جاتی تھیں۔ اس راج محل میں صرف راجکماریاں ہی ایسی تھیں جو اس وقت ہنس ہنس کر کہتی تھیں۔ دیکھو خاوند صاحب آج سسرال میں گا نا گا رہے ہیں۔

راج کماریوں کا آنند اور جوش دو ہی روز میں جاتا رہا۔ بسنت کے ساتھ ایک ہی قسم کی ہنسی مذاق سے ان کا جی اُکتا گیا۔ انہوں نے نئے ڈھنگ کی خوشی پیدا کرنے کے لئے کرناٹک کلنگ وغیرہ ممالک کے راجاؤں کی طرف اپنے دل کی توجہ مبذول کی۔

اب راج کماریوں کے نہ آنے سے بسنت اپنی زندگی کے چاروں طرف قدرے خوشی محسوس کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ اب راجکماریاں تو نہیں آتیں لیکن اس کے بھوجن کا برتن دونوں وقت باقاعدہ طور پر طاق

میں رکھا جاتا ہے۔ جو اس کے لئے بھوجن لاتی ہے۔ اس کے نازک ہاتھ ہیں
وہ کوئی دیاوان عورت ہے۔ وہ اب ایک کٹورا بھر ستو لاتی ہے۔ اور گلاب
جل اور دودھ میں ملائے ہوئے اس ستو کے نیچے طرح طرح کے کھانے چھپے
رہتے ہیں۔ کٹورا ایک خوشبودار پھولوں کی مالا سے لپٹا ہوا رہتا ہے۔
اس سے بسنت نے سمجھا کہ اس سنگ دل راج محل کے اندر بھی ایک
دو نرم دل والی عورتیں ہیں۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہونے لگا کہ یہ
دیاوان استری کون ہے؟
رفتہ رفتہ بسنت کا دل اس پُر رحم خادمہ کی طرف رجوع ہونے لگا۔
بسنت بھوجن آنے والے دروازے کی طرف تکتا رہتا تھا کہ کب
اس دیاوان استری کے نازک ہاتھ بھوجن کا برتن رکھنے کے لئے آتے ہیں
دیکھتے دیکھتے بسنت کو ان ہاتھوں کے درشن کرنے کا وقت ایک طرح سے
تحقیق ہو گیا۔ جس وقت طاق کے منہ پر دیوار کا سایہ کچھ کچھ پڑتا تھا۔ گھر
میں اندھیرا کچھ کم ہوتا تھا اور ہوا آنے کے سوراخوں کے ذریعے جب سورج
کی چوڑی کرنیں اندر آتی تھیں۔ اسی وقت پُر رحم عورت ظاہر ہوتی تھی۔
اس وقت وہ باہر کی ہوا کی سرسراہٹ۔ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور آنے
جانے والے لوگوں کے قدموں کی آہٹ بسنت کو ہر لحہ بے قرار کرتی
تھی۔ اور وہ آنکھوں کو اپنے دل کا مرکز بنا کر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے
بعد جب وہ عورت دیوی کی مانند بھوجن کے کٹورے کو طاق میں رکھ کر
ملائم اور شیریں آواز سے پکارتی تھی۔ بسنت اس وقت بسنت خوش

ہو کر ایک ہی چھلانگ میں قریب جاکر دونوں ہاتھوں سے اس کٹورے کو پکڑ لیتا تھا۔ لیکن اپنے اس ناآشنا اور نادیدہ دوست کے ہاتھوں سے کٹورا لینے میں اُسے بہت وقت لگتا تھا۔

وہ ہاتھ بسنت کی زندگی کا دارومدار تھے۔ انہیں وہ اپنی ساری امیدوں اور خواہشات کا سہارا سمجھتا تھا۔ اور بڑے غور سے انہیں ہی دیکھتا رہتا تھا۔ ان ہاتھوں کی خاص صورت کو۔ انگلیوں کی خاص طرز کو ناخنوں کی خاص بناوٹ کو ہتھیلیوں کی لکیروں کی ساخت کو۔ اور داہنے ہاتھ کی کلائی کے ایک چھوٹے سے سیاہ تل کو دیکھتے دیکھتے بسنت اس طرح واقف ہو گیا تھا کہ ہزاروں میں بھی وہ ان ہاتھوں کو تلاش کر کے نکال سکتا تھا۔ ان ہاتھوں کی انگلیوں کے لگنے سے ہی بسنت کے بدن میں جوش و مانی پیدا ہوتی تھی۔ وہ صاف طور پر بتلاتی تھی کہ جس کی یہ انگلیاں ہیں وہ جوان استری شرمیلی اور پُر رحم ہے۔ بسنت سوچتا تھا کہ یہ ہاتھ جس بدن کو آراستہ کرتے ہیں۔ یہ دل جس جسم کا متحرک ہے۔ اور یہ شیریں آواز جس جسم کا زیور ہے وہ جسم نہ جانے کس قدر خوبصورت اور لاثانی اور کس قدر قابلِ تعریف ہوگا۔

ایک دن بسنت سے نہ رہا گیا۔ اُس نے مذکورہ بالا دونوں ہاتھوں کو دبا کر کہا دیوی میرے اوپر یہ قرضہ کا بار کس کی طرف سے چڑھ رہا ہے۔ تم کون ہو جو اس قیدی کو اور بھی مضبوط بیڑیوں سے جکڑ رہی ہو گیا۔ میں قرضدار ہی ہوتا چلا جاؤں گا؟ اس جگہ اس قرض کی ادائگی کی کوئی بھی سبیل

وہ بے چاری بے طاقت، کم جرأت اور بدصورت ہے۔ اس کے بیرونی جسم کو تو پرمیشور نے پوشیدہ کر رکھا ہے اور اندرونی حالت کو اس نے خود چھپا رکھا ہے پھر اس کی ایسی قسمت کہاں جو تمہارا کچھ خیال کر سکے اور حسن محل سرا میں ایک بے خطا شخص ہر لمحہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ اسے چھوڑ کر وہ کہاں جاوے۔ اس کی بہنوں نے جو گناہ کیا ہے۔ اس کا کفارا اسے دینا ہوگا۔

بسنت نے متعجب ہو کر کہا "تو جمنا مجھے یاد کرتی ہے"۔

بسنت وہ یاد ہی کیا کرتی ہے۔ رات دن تمہارے ہی نام کی مالا جپتی رہتی ہے۔ تم نے اسے جو اس قدر عرصہ تک پھولوں کی مالائیں نذر کر کے راگ سنا کر اور محبت کا سبق دے کر خوش کیا ہے تو آج وہ کیا تمہیں مصیبت کی حالت میں بھول جائے گی؟ اتنی بڑی جرأت کرنے کی اس میں طاقت کہاں۔

بسنت شرمندہ ہو کر بولا میں نے تو اسے کسی دن بھی خوش نہیں کیا تھا میں تو اسے پس ماندہ بے خوشبو پھولوں کی ایک دو بے ڈھنگی سی مالا بنا کر حقارت سے دے دیتا تھا۔

سوبھدرا نے مودبانہ عرض کی۔ وہ تو اسی مالا کو بڑی عزت سے اپنی پیشانی پر رکھتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کبھی حاصل نہیں کیا تھا اس لئے آپ کی معرفت جو کچھ کم و بیش حاصل کرتی تھی۔ اسی کو بڑی خوشی سے منظور کرتی تھی۔

اگر ایسا ہے تو اس نے میرے ساتھ شادی کرانا کیوں منظور نہیں کیا؟

نظر نہیں آتی۔
نوجوان لڑکی نے محبت بھری آواز سے کہا اے مالی تم مت ڈرو۔ جو تمہاری بڑی مقروض ہے وہ ہی اس وقت اپنی شکر گزاری کا ایک حصہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔
بسنت نے متعجب ہو کر پوچھا۔ میرے قرضہ سے دبی ہوئی ہو؟ تم کون ہو؟
جوان استری نے جواب دیا میرا نام سبھدرا ہے۔
بسنت آہستہ سے بولا۔ اے نیک بخت تم کون ہو یہ میں نہیں جانتا ہوں۔ لیکن تمہاری مہربانی کو دیکھ کر مجھے اب پھر دنیا میں آنے کی خواہش ہوتی ہے۔
جوان استری نے گھبرا کر کہا میں اپنی جان قربان کر کے بھی اگر تمہیں چھڑا سکتی تو ایسا کرنے میں بالکل دریغ نہ کرتی۔ جوان استری کا یہ کلام آنسوؤں سے تر تھا۔ بسنت نے اس لرزتے ہوئے اور بھیگے ہوئے کلام کو اپنے دل میں محسوس کیا۔ اس نے بھولے پن سے کہا۔ راج کماریاں کیا اس بدقسمت کو کبھی ایک دفعہ بھی یاد نہیں کرتیں؟
نہیں بسنت انہیں ایسی حقیر باتوں کو سوچنے کی کہاں فرصت ہے اندرا، شکلا اور اننتا تینوں کرناٹک، کلنگ اور مدر دیش کے تخت کو مزین کرنے کے خیال میں مصروف ہو رہی ہیں۔
اور راج کماری جمنا؟

اس لئے کہ وہ بدقسمت ہے جس وقت وہ آپ کے پاس گئی تھی ۔اُس وقت آپ نے اس سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ صرف اپنی مصیبت میں مبتلا ہو کر آپ نے اُسے رخصت کر دیا تھا۔

بسنت کا من رنج و راحت میں غلطاں و پیچاں ہونے لگا۔ اس نے بلند آواز سے کہا تو اس وقت وہ مجھے دیکھنے کے لئے کیوں نہیں آئی۔

سوبھدرا نے کچھ اوپر اُٹھ کر اپنی صاف اور خوبصورت نظر کو طاق میں سے ڈالا اور کہا آپ کے دیکھنے کے لئے برابر آتی ہے۔ لیکن بڑی ہی شرمیلی اور کم جرأت ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتی ہیں۔ اسی کی مرضی سے آپ کی خدمت کرتی ہوں۔

بسنت نے خوش ہو کر سوبھدرا کے ہاتھوں کو اور بھی زور سے پکڑ کر کہا۔ اے دیوی تمہاری باتیں سُنکر مجھے اب پھر زندگی کی خواہش ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی تمام عورتیں اندرا، شکلا اور آنند تا ہی نہیں ہیں۔ ان میں جمنا اور سوبھدرا جیسی بھی ہیں۔ اے دیوی میں نے جمنا کو دیکھا تو تھا لیکن یہ سمجھا تھا کہ وہ ایسی نیک خصلت ہو گی۔ تمہیں دیکھا نہیں ہے مگر پھر بھی سمجھ لیا ہے کہ تمہاری طبیعت کیسی اچھی ہے۔ جمنا کو بدصورت دیکھ کر میں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ مجھے اُس کی شرم آج اس کی مہربانی کے باعث ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ تم اُس سے ظاہر پرست کی بے ادبی معاف کرنے کے لئے درخواست کرنا اور اے دیوی اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہو تو میں بچ سکتا ہوں۔ اسی تنگ و تاریک قید خانے سے میں آسانی سے رہائی

حاصل کر سکتا ہوں۔

سوبھدرا بولی۔ میں بھی تو جمنا کی طرح بدصورت اور بدشکل ہوں۔

بسنت نے بلند آواز سے کہا۔ خواہ تمہاری شکل سیاہ فام اور بدنما ہو تاہم بھی وہ میرے لئے باعث آرام ہوگی جس کے ایسے رنج دور کرنے والے ہاتھ ہیں۔ جس کا ایسا رحیم دل ہے اور جس کا ایسا مؤدب اور شیریں گلو ہے۔ اس کی خوبصورتی کی حد نہیں ہے۔ اس کا ثانی تمام دنیا میں نہیں مل سکتا۔

سوبھدرا نے کہا تم نے میری نسبت کچھ دریافت تو کیا ہی نہیں؟

بسنت بولا میں اب تمہاری نسبت کچھ بھی معلوم کرنا نہیں چاہتا۔ ایک دفعہ میں اس بیرونی تحقیقات کے جھگڑے میں پڑ کر جمنا کا قصور وار بن چکا ہوں۔ تمہاری اندرونی واقفیت ہی میرے لئے کافی ہے۔ اتنا ہی جاننا کافی ہے تم سوبھدرا ہو۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ آخری واقفیت ہی تم مجھے دے دو۔ کہو دیوی اگر میں یہاں سے مخلصی پا کر باہر جاسکوں۔ تو کیا تم راج کماریوں کی صحبت اور راج محل کی شان و شوکت چھوڑ کر میری جھونپڑی میں چلنے کے لئے چلنا منظور کرو گی۔ ایک معمولی مالی کا ہاتھ تم پکڑ سکو گی؟

سوبھدرا کو بڑی شرم دامنگیر ہوئی۔ وہ اپنے منہ سے کس طرح کہہ دے کہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ اس کا دل باہر آ کر کہنا چاہتا تھا کہ ہاں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں چاہتی ہوں۔ سب کچھ چھوڑ کر میں

تمہاری جھونپڑی میں آرام سے رہوں گی۔ تمہیں خوش رکھنا ہی میرا سب سے بڑا دھرم اور آخری خواہش ہے۔ لیکن بباعث شرم وہ زبان نہ ہلا سکتی تھی۔ وہ ابھی تک جواتنی گفتگو کر رہی تھی۔ اس کا باعث یہ تھا کہ اول تو بسنت کے اور اس کے درمیان ایک آڑ تھی۔ دوئم بسنت اس سے واقف نہ تھا۔ لیکن ناواقفیت اور آڑ ہونے کے باعث بھی وہ اپنے منہ سے شادی کا وعدہ نہیں کر سکتی تھی۔

جواب نہ ملنے سے بسنت نے پھر کہا۔ کہو سوبھدرا کہو۔ اس بدقسمت کی رنج و راحت زندگی اور موت تمہارے ہی جواب پر موقوف ہے کیا تم اس معمولی مالی کو قبول کر سکتی ہو؟

سُوبھدرا حیا سے سکڑ کر بمشکل تمام دھیمی آواز سے بولی۔ بسنت اگر تم معمولی آدمی ہو تو میں بھی تو غیر معمولی نہیں ہوں۔ تم اگر مجھے کالی اور بدصورت جانتے ہوئے بھی قبول کر دگے تو تمہاری جھونپڑی میرے لئے محل سے بڑھ کر ہو گی۔

تھوڑے سے الفاظ زبان سے نکال کر سُوبھدرا خود شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

بسنت نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ سوبھدر میں زندہ رہوں گا۔ اور محض تمہارے لئے ہی زندہ رہوں گا۔ اب تم میرے لئے کچھ لکھنے کا سامان لا دو۔ جس سے میں اپنی رہائی کی تجویز کر سکوں۔

شب کو لا دوں گی۔ یہ کہہ کر سوبھدرا اپنے مہربان کی مٹھی ڈھیلی کر کے اور

اس میں سے اپنے ہاتھ چھڑا کر چلی گئی۔
قیدی کے خوش الحان راگ سے آج سارا محل یکایک متحیر ہو گیا۔ اس دلکش آواز کو سنکر ہر ایک سننے والے کے دل میں خوشی کی لہر اٹھنے لگیں۔ لیکن جمنا ایک کونے میں جا کر نہ معلوم کیوں رونے لگی۔
بسنت کا دل آج محبت کا عوض ملنے سے خوش ہو رہا ہے اور اپنی محبوبہ کے نازک ہاتھوں کے چھونے سے اس کے سارے بدن میں خوشی سے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ وہ بے قراری سے رات کی انتظار کر رہا ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس تاریک قید خانہ کے لوہے کے سخت کواڑ بالکل کھل گئے ہیں۔ اور وہ چاندنی میں پھولوں کی سیج پر بیٹھا ہوا سوبھدرا کو پھولوں سے سجا رہا ہے۔
تاریک قید خانہ کے اندھیرے کو زیادہ گہری ہوتی رات آ گئی۔ اس کے بعد گہرے اندھیرے کو یکایک خوش کر کے روشن چراغوں کی سنہری شعاعوں نے گویا کالے ریشم کی رزی بُننی شروع کر دی۔ باہر سے سوبھدرا نے آہستہ سے کہا۔ بسنت!
بسنت نے باغ باغ ہو کر کہا سوبھدرا!
سوبھدرا نے کاغذ۔ قلم۔ دوات کو طاق میں سے آگے کر کے کہا یہ لو۔
خوش دل بسنت نے طاق کے راستہ سے آنے والی برائے نام روشنی کی مدد سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بڑی مشکل سے ایک چٹھی لکھی اور پھر کہا دیوی اقرار کرو کہ یہ چٹھی تم نہ پڑھو گی اور جمنا کو بھی نہ دکھلاؤ گی؟ اگر مہربانی کر کے اسے تم اونتی پوری کے راجہ کے وزیر کے پاس بھیج دو گی۔ تو میں اس قید خانہ سے

باآسانی رہائی پا جاؤں گا۔
سوبھدرا نے کہا، میں قسم کھاتی ہوں۔ آپ کے حکم کی حرف بحرف تعمیل کروں گی۔
اسی رات کو ایک قاصد خط لے کر اونتی پوری کو روانہ ہو گیا۔
قاصد کو اونتی پور جا کر واپس آنے میں جس قدر عرصہ لگنا چاہئے بسنت نے اس کا اپنے دل میں اندازہ کر لیا۔ اور پھر وہ اپنے تاریک قید خانہ میں جہاں کہ تاریکی کے باعث رات دن میں کوئی تمیز نہ تھی، چھت کے سوراخوں میں سے جو سورج کی معدود کرنیں آتی تھیں۔ ان کی گھڑی دیکھ دیکھ کر اور سوبھدرا سے دریافت کر کے دن شمار کرنے لگا۔
ایک دن سوبھدرا نے آ کر کہا۔ بسنت آج اونتی راج کا وزیر فوج لے کر آ گیا ہے۔ لیکن وہ تو آپ کی رہائی کے لئے کچھ بھی کوشش نہیں کرتا۔
بسنت نے ہنس کر دریافت کیا تو وہ کس غرض سے آیا ہے!
وہ تو شادی کی تجویز میں آیا ہے کس کی؟
راجکماری جمنا کے ساتھ، ونتی کے مہاراج کے بھائی کی ہور مہاراج کے ساتھ۔ . . . .
سوبھدرا اس سے آگے اور کچھ نہ کہہ سکی، شرم سے اس کے منہ کی بات منہ میں ہی رہی۔
سوبھدرا کو شرم کے باعث خاموش دیکھ کر بسنت نے ہنس کر دریافت کیا او رادونتی کے مہاراج کے ساتھ کس کی شادی کی تجویز؟
سوبھدرا کے منہ پر شرم کی سرخی نمودار ہوئی۔ اس نے نیچا سر کر کے آہستہ

سے کہا۔ اس بدقسمت سوبھدرا کی۔
بسنت نے جوش ظاہر کر کے کہا اچھا تب تو بڑی خوشی کی بات ہے۔
سوبھدرا بسنت کے جوش ظاہر کرنے سے رنجیدہ ہو کر بولی۔ بسنت یہ خوشی کی بات نہیں ہے۔
بسنت متعجب ہو کر بولا کیوں! اونتی کا راجہ تو چکرورتی راجہ ہے۔ پھر خوشی کی بات کیوں نہیں۔
سوبھدرا نے مضبوط دل ہو کر کہا۔ اونتی کا راجہ بیشک چکرورتی راجہ ہے لیکن سب کی طبیعتوں کا لبھانے والا تو نہیں ہے۔
تب کیا چکرورتی راجہ کی درخواست فضول جائے گی؟
فضول تو ویسے ہی ہوتی اگر راجہ کا بھائی جسنا کو خود دیکھتا تو اُس کی ضد اس کے لئے ہرگز قائم نہ رہتی۔ اور سوبھدرا تو اس راج محل میں ایسی گمنام ہے کہ اُسے کوئی شخص نہیں پہچانتا۔ راجہ کے عقلمند سے عقلمند جاسوس بھی اسے ڈھونڈھ کر نہیں نکال سکتے۔ لیکن البتہ اس محل سرا میں ایسی راج کماریوں کی کمی نہیں جو راج کی تمنا رکھتی ہوں۔ وہ راجہ کی خواہش کو فضول نہ جانے دیں گی۔
بسنت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سوبھدرا اب میری رہائی بہت جلدی ہونے والی ہے۔ آج اس تاریکی میں ہماری تمہاری یہ آخری ملاقات ہے کل ہزاروں میں تمہارے جن ہاتھوں کو دیکھ کر میں تمہیں پہچان سکوں گا۔ آج ان ہاتھوں سے تم مجھے باہر آنے کے لئے مدعو کر جاؤ۔
سوبھدرا نے اپنے کانپتے ہاتھ طاق میں سے آگے بڑھا دیئے۔ بسنت

نے انہیں اپنے بے قرار ہاتھوں سے کس کر جکڑ لیا۔ لیکن اس کے مضطرب ہونٹ اس قدر دُور نہ جا سکے۔

دوسرے دن سویرے ہی بسنت کی گہری نیند میں مزاحمت پیدا کر کے قید خانے کے کواڑ آواز کرتے ہوئے کھل گئے۔ کاشی کا راجہ اونتی کے وزیر کے ہمراہ قید خانہ میں آیا۔

کاشی کے راجہ نے بسنت کے قدموں میں پڑ کر دست بستہ عرض کی کہ مہاراج میری دانستہ خطاؤں کو معاف کیجئے۔

وزیر نے آداب بجا لا کر کہا۔ چکرورتی مہاراج کی جے ہو۔

بسنت کاشی کے راجہ کو خوف سے دور کر کے قید خانے سے باہر ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں اشنان وغیرہ کر کے لباس فاخرہ زیب تن کیا۔

کاشی نریش نے اپنی خوف زدہ اور شرمیلی لڑکیوں کو بسنت کے سامنے بلوایا۔ وہ سب یکے بعد دیگرے حاضر ہوئیں۔ اور دُور سے آداب بجا لا کر ایک طرف سر نیچا کر کے کھڑی ہو گئیں۔ سب کے پیچھے جمنا آئی۔ اُس نے شرم سے سکڑ کر نزدیک آ کر پرنام کیا۔ اس کے تازہ اشنان کئے ہوئے بالوں نے بکھر کر بسنت کے دل کو موم بنا دیا۔ اس وقت اس نے جمنا کی پیشانی چھو کر گویا یہ چاہا۔ کہ میں دل کی گہری محبت کے جل سے اپنے ناشائستہ سلوک کو دھو ڈالوں۔

کاشی کے راجہ نے کہا۔ مہاراج ان انجان لڑکیوں کا قصور آپ کو معاف کرنا ہوگا۔

بسنت نے کہا۔میں نے ان سب کو آپ کی اس حقارت شدہ اور ناپسندیدہ لڑکی کے اوصاف سے خوش ہو کر معاف کر دیا ہے۔اور مجھے خود اس سے معافی مانگنی ہے۔

یہ کہہ کر بسنت نے اور راج کماریوں کی طرف نہ دیکھ کر صرف جمنا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔جمنا تم میری سابقہ خطاؤں کو معاف کر دو۔

جمنا نیچا سر کیے ہوئے ناخنوں سے زمین پر کچھ لکھنے لگی۔اپنی مغرور بہنوں اور نامہربان باپ کے سامنے اُسے یہ شرم وحیا ناقابل برداشت ہو گئی۔

بسنت اگرچہ اس وقت سب سے باتیں کر رہا تھا۔لیکن اس کی آنکھیں بے قرار ہو کر حرم سرائے کے چاروں طرف ہر ایک کو اٹھ کی اوجھل میں کسی کی تلاش کرتی معلوم ہوتی تھیں۔اس کی سُو بھدرا کہاں ہے۔اس کی خدمتگار کہاں ہے۔اس کی پیاری کہاں ہے۔وہ تو اس کی شکل سے ناآشنا ہے اس کے ہاتھوں سے اس کی آواز سے اور اس کے دیادان دل سے آشنا ہے

اپنی درخواست کا جواب نہ پا کر بسنت کی آنکھیں جمنا کی طرف پھر گئیں جمنا کے ہاتھ دیکھ کر اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی۔یہ وہی ہاتھ تھے۔جو اُس قید خانہ کی تاریکی میں روشنی کر کے مجھے تسلی دیتے تھے۔وہی انگلیاں وہی ہتھیلی کے نشان وہی کلائی پر تل سب کچھ وہی تھا۔

بسنت کا چہرہ خوشی سے کھل گیا

شادی کی شکرگزاری کے نبھانے والے لمس سے جمنا کی صورت بسنت کی نظر میں نہایت ہی خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ایک نہایت خوبصورت

اور لاجسم دیوتا کے بر سے بسنت کی نظر میں جو محبت کا سُرمہ ڈالا گیا تھا۔ اس کے باعث یہ معلوم ہونے لگا کہ جمنا لاثانی جوانی سے۔ خوشی اور شیریں پن سے خوبصورتی اور زندہ رستی کی حالت میں جگمگا رہی ہے۔ بسنت نے اس وقت کاشی کے راجہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ آپ سے میں ایک بھیک مانگتا ہوں۔

بھیک؟ مہاراج آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ ایسے الفاظ سے خطاوار کی خطا اور زیادہ نہ کیجئے۔ مجھے تو حکم دیجئے۔

اچھا آپ نے جو میرا قصور کیا ہے۔ اُس کی پاداش میں میں آپ کے خزانہ کا ایک بیش قیمت جواہر لینا چاہتا ہوں۔

یہ تو آپ کی عنایت ہے۔ اور میری خوش نصیبی ہے۔ حکم دیجئے خزانچی آپ کے حکم کی انتظار کر رہا ہے۔

بسنت نے ہنس کر کہا میں جس جواہر کا ذکر کرتا ہوں۔ اس جواہر کو آپ کا خزانچی نہیں پہچان سکے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کا پتہ لگایا ہے۔ وہ دور بھی نہیں ہے۔ دیکھئے یہ ہے۔

یہ کہہ کر بسنت نے کچھ آگے جُھک کر جمنا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور لوگوں کے تعجب کی پرواہ نہ کر کے اس نے ہنس کر کہا۔ کیوں سوبھدرا۔ کیوں جمنا ایک چکرورتی راجہ کے ساتھ ایسا دغا؟ ٹھیرو میں تمہیں اس کی سزا دیتا ہوں۔ کاشی سے اُونتی کے راج محل میں تمہیں جلاوطن کیا جاتا ہے۔ کیوں یہ سزا منظور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج اونتی کے راجہ کی درخواست فضول نہ جائے گی